عابدہ یونس

خزاں رسیدہ پتے

"کیا کر رہے ہیں آپ؟" عابدہ بیگم نے چہرے پہ نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے اپنے شوہر کو پکارا۔

حسین صاحب نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کچھ نہیں فارغ ہوں۔" ان کی نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں۔

"مجھے لگتا ہے ہمیں برہان کی منگنی کر دینی چاہیے۔" وہ اسی طرح آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"کس سے؟" ان کی بات پہ وہ چونکے تھے۔ آنکھوں میں حیرانی واضح تھی۔

"رامین سے اور کس سے؟" عام سے انداز میں کہتی وہ ان کے پاس ہی بیڈ پہ ٹک گئیں۔

"آپ کو میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ میں نے زاہدہ آپا سے رامین کے بارے میں بات کی تھی اور میں رامین کو ہی اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ برہان بھی یہی چاہتا ہے۔" وہ کام روک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ عابدہ بیگم لفظ پر زور دیتے ہوئے تحمل سے بولیں تھیں۔

"تم نے بات کی تھی یا انہوں نے؟" وہ وقفے سے بولے۔ آنکھوں میں کچھ چبھن تھی۔

"ارے ہم دونوں نے ہی کی تھی اور برہان بھی تو خوش ہے۔" وہ گڑبڑا گئیں۔

"لیکن میں کچھ اور چاہتا ہوں۔" وہ مسکرائے اور ان کی طرف دیکھا۔

"میں زینب کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں۔ مجھے زینب سے بہت محبت ہے یہ بات تم بھی جانتی ہو ہے نا!" حسین صاحب کی بات سن کر عابدہ بیگم کے

مکمل ناول

چہرے اور آنکھوں میں غصہ و نفرت ایک ساتھ در آئے۔

"لیکن میں ایسا نہیں چاہتی اور ہاں! میں اپنی بہن کو زبان دے چکی ہوں اور اب میں مکرنا نہیں چاہتی۔" وہ تنفر سے کہہ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئیں۔

"چلو پھر وقت آنے پر دیکھتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

حسین صاحب اب شاید کام نہیں کر سکتے تھے اس لیے اٹھ کر بالکونی میں آ گئے، وہاں ہر سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ رات اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ خاموش، پرسکون، اداس۔

ان کے چار بچے تھے۔ برہان، سمیرا، ارمان اور انابیہ۔ انہیں اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت تھی ہر باپ کی طرح۔ لیکن کچھ تھا جو وہ اس معصوم پری زینب کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتے تھے وہ کیا تھا جو اپنے بھائی کی بیٹی سے وہ کرتے تھے۔ محبت یا محبت کی انتہا۔

برہان ڈی ایس پی آف پولیس تھا۔ سنجیدہ، اکھڑ مزاج اور کسی حد تک لاپرواہ۔ وہ باپ کا فرماں بردار تھا لیکن اپنی ماں کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ سمیرا کا گریجویشن مکمل تھا اور وہ فی الحال گھر تھی باقی دونوں بچے ارمان اور انابیہ زیر تعلیم تھے۔

☆☆☆

حسین صاحب کے بڑے بھائی داؤد صاحب اپنے دو بچوں حمزہ اور زینب کے ساتھ گاؤں میں حویلی میں رہتے تھے۔ گاؤں میں رہ کر زمینوں کی دیکھ بھال سب ان کے ذمے تھی اور حسین خود اپنے بچوں کے ساتھ شہر میں رہتے تھے۔

اگلی صبح ...... ناشتے کی میز پر برہان اور عابدہ دونوں بیٹھے تھے۔ حسین کام پر چلے گئے تھے اور باقی تینوں بچے ابھی سو رہے تھے۔ پورے گھر میں قریباً خاموشی کا راج تھا۔

"برہان تمہیں رامین کیسی لگتی ہے؟" شیریں لہجے میں اپنے لخت جگر کو مخاطب کیا۔

"کیا مطلب ممی؟" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ کچھ الجھ کر بولا۔

"میرا مطلب ...... میں رامین سے تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔" ان کی بات سن کر ایک خوب صورت مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ یعنی کہ سب عابدہ کی مرضی کے مطابق تھا۔

"لو یو ممی ...... آپ ہمیشہ میرے دل کی بات جان جاتی ہیں۔" وہ ان سے لپٹتے ہوئے بولا۔ پھر سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ویسے ممی۔ کیا پاپا مان جائیں گے؟" کسی اندیشے کے تحت وہ بولا۔

"یہی تو ساری پرابلم ہے۔ وہ زینی کو پسند کرتے ہیں اور تم جانتے ہو، مجھے زینی زہر لگتی ہے۔" ان کے لہجے میں حقارت تھی۔

"ایسے تو مت کہیں ممی! زینی ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ بالکل معصوم سی۔" سمیرا پتا نہیں کب وہاں آن پہنچی اور انہیں ٹوکا۔

"تم کیوں اس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو؟ اور کم از کم میرے سامنے اس بے کار لڑکی کی تعریفیں مت کیا کرو۔" برہان نے انتہائی حقارت سے اس سے کہا۔ سمیرا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور دوسری طرف عابدہ کا اطمینان دوگنا ہو گیا۔ زینی کی انسلٹ اور وہ بھی سمیرا کے سامنے۔

"بھائی! آپ بھی ......" وہ غصے سے کہہ کر وہاں سے بنا ناشتہ کیے ہی چلی گئی۔

☆☆☆

پوری حویلی میں صبح کی پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سورج کی سنہری کرنوں نے پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ملازمین اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ زینب اپنے کمرے میں آئینے کے

سامنے کھڑی بالوں میں جلدی جلدی برش پھیر رہی تھی۔ داؤد صاحب ناشتے کے لیے اسے دو تین آوازیں لگا چکے تھے۔ وہ نماز ادا کر کے اب بالوں کو سنوار رہی تھی جلدی جلدی بالوں کی سادہ سی چٹیا بنا کر دوپٹہ شانوں پہ پھیلا کر وہ ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئی۔ حویلی گاؤں میں تھی لیکن جدید طرز سے بنائی گئی تھی، اندر سے وہ بالکل بھی کسی گاؤں کی عمارت نہیں لگتی تھی۔ ڈائننگ ہال بھی جدید طرز سے بنایا گیا تھا۔ داؤد صاحب سربراہی کرسی پر بیٹھے تھے اور دائیں طرف حمزہ بیٹھا تھا۔ زبیدہ خاتون میز پہ ناشتے کے لوازمات سیٹ کر رہی تھیں۔ وہ داؤد صاحب کے بائیں طرف بیٹھ گئی اور نیپکن درست کرنے لگی۔

"دیر تو نہیں کی نا میں نے!" وہ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر بشاشت سے بولی۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔ آج تو صرف تین ہی آوازوں پر آ گئی ہو۔" داؤد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زینب! اوپر والے پورشن کی صفائی کروا دینا۔ اپنی نگرانی میں اوکے!" انہوں نے نیپکین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ حمزہ جو وہاں سے جانے لگا تھا ٹھٹھک کر وہاں رک گیا۔ ابرو سوالیہ انداز میں اٹھائے۔

"خیریت بابا۔" دونوں نے ہم آواز پوچھا۔

"ہاں یار! خیریت ہی ہے۔ بس تمہاری پھپھو عائشہ کچھ مہینوں کے لیے یہاں شفٹ ہو رہی ہیں۔ کیونکہ تمہارے پھوپھا کام کے سلسلے میں لندن جا رہے ہیں۔" انہوں نے سرسری انداز میں وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ زینب کی تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں کہ مزہ آئے گا۔

"اوکے بابا! پھر میں کورٹ جا رہا ہوں۔ مجھے ضروری کام ہے وہاں اور ہاں میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا ٹھیک!" حمزہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ زینب اٹھ کر ملازمین کی زیر نگرانی اوپر کے پورشن کی صفائی کروانے لگی اور داؤد صاحب کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

پھپھو بھی گاؤں کی حویلی میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ ان کے تین بچے بڑی بیٹی اریشہ، بیٹا حماد اور چھوٹی بیٹی علیشا تھی۔ پھپھو دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھیں۔ اسی لیے ان کی بڑی بیٹی اریشہ زینب کی ہم عمر تھی۔ باقی دونوں بچے چھوٹے تھے۔

"بھائی آپ نے زینب کی شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔" عائشہ پھپھو نے گفتگو کا آغاز کیا۔ مقصد کچھ اور تھا شاید۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے ابرو اٹھائے۔

"میرا مطلب، ہمارے بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے اریشہ کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ زوہیب بھی میری پسند سے اتفاق کرتے ہیں۔ آپ کو بتاؤں وہ کون ہے؟" وہ رسان سے بولیں۔ داؤد صاحب نے ابرو سوالیہ انداز میں چڑھائے۔

"حمزہ۔" عائشہ پھپھو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بھائی میں حمزہ سے اریشہ کی شادی کرنا چاہتی ہوں کیا آپ ......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ داؤد صاحب مسکرا دیے۔

"عائشہ! تم جانتی ہو، میں بھی تم سے حمزہ کی رائے پوچھ کر ہی بات کرنے ہی والا تھا۔" خوشی ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی، وہ واقعی خوش تھے۔

"اور رہی بات زینب کی تو زینب کے لیے مجھے برہان پسند ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"لیکن بھائی، عابدہ بھابھی؟ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔" عائشہ نے اندیشہ ظاہر کیا جو واقعی تھا۔

"یہی سوچ کر تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔" داؤد صاحب سنجیدہ تھا۔

"بھائی! عابدہ نے آپ دونوں بھائیوں کو ساتھ نہیں رہنے دیا۔ حسین کو لے کر شہر چلی گئی، اپنے بچوں کی تربیت میں اس نے ننھیال کے لیے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ کیسے زینب کو قبول کرے

گی جس نے کبھی اپنے سسرال کو قبول نہیں کیا۔ اس طرح اگر ہم زبردستی کریں گے تو زینب کو بہت مشکل ہوگی۔" عائشہ جو کہہ رہی تھیں وہ سوفیصد سچ تھا۔ داؤد صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ یقیناً یہ گفتگو دونوں بہن بھائی رازداری سے آپس میں کر رہے تھے مگر وہاں کھڑی زینب نے ہر لفظ غور سے سنا تھا۔ وہ کچن میں مونگ پھلی کا پیکٹ لینے آئی تھی کہ وہ اور اریشہ باتیں کریں گی مگر اریشہ کے ذکر پہ ٹھہر گئی۔ برہان کے ذکر پہ ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی۔ سیاہ آنکھیں بھی ویران سی ہو گئی تھیں۔

پھپھو کی اپنے دیور یا جیٹھ میں سے کسی کے بھی گھر نہ جانے کی وجہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ کیوں وہاں نہیں گئیں۔ پر ایک بات اسے پریشان کر رہی تھی وہ بھی اریشہ اور حمزہ کے رشتے کی بات......!

کسی بھی ماں کے لیے اس کی اولاد بوجھ نہیں ہوتی پھر پھپھو خود اپنے منہ سے اپنی بیٹی کا رشتہ...... عجیب بات تھی۔ وہ قدم قدم زینے عبور کر رہی تھی اسے ضرور اریشہ سے یہ بات کلیئر کرنی چاہیے، ہوسکتا ہے اریشہ خوش نہ ہو، وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟ ہو بھی سکتا ہے؟

اس نے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔

اجازت پا کر وہ اندر داخل ہوئی اریشہ بیڈ پہ لیپ ٹاپ سامنے کیے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ آپس کی باتیں کرتی رہیں پھر زینی اپنی بات کی طرف آئی۔

"اریشہ! وہ مَیں نے پوچھنا تھا کہ......" وہ اٹک رہی تھی۔

"کیا بات ہے زینی! بے فکر ہو کے پوچھو جو پوچھنا ہے تم نے۔" اریشہ نے اس کو اطمینان دلایا۔

"اریشہ! کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" اس کی بات سن کر اریشہ کا رنگ اڑ گیا۔ اتنا بے تکا سوال اور وہ بھی...... اتنی اچانک۔

"کیا مطلب......؟" وہ ہونق ہوئی پوچھ رہی تھی۔

"میرا مطلب...... اگر پھپھو تم سے پوچھے بنا ہی تمہارا کسی سے رشتہ طے کر دیں تو تمہیں کیسا لگے گا؟" زینب اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے تحمل سے بولی۔

اریشہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"زینی! ممی نے ایک دفعہ مجھے موقع دیا تھا کہ میں اپنی زندگی کے اس فیصلے کے بارے میں سوچوں۔ میں نے ممی کے کہنے کے مطابق سوچا تو...... وہ رکی۔ "مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے کزن عمر کے بنا زندگی نہیں گزار سکوں گی۔ عمر کا والہانہ پن دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی لگتا تھا کہ ہم دونوں کی کنڈیشن سیم ہے۔ پھر ایک دن اچانک جانتی ہو، کیا ہوا؟"

وہ جو خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی چونکی۔ اریشہ اس کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس رکھے میرون صوفے پہ بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھ کے کنارے پہ اٹکا تھا۔ زینب کا دل اداس ہو گیا۔ (اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔) وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

"پھر ایک دن اچانک ہمیں خبر ملی کی دادا کے نام تمام جائیداد میرے چچاؤں نے بیچ دی ہے اور میرے دونوں چچا اب بیرون ملک شفٹ ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس جائیداد میں سے ہمیں کچھ نہیں دیا، تینوں بھائیوں کا کاروبار بھی مشترکہ تھا۔ انہوں نے وہ سارا کاروبار دوسرے ملک شفٹ کر دیا۔ وہ دن ہمارے لیے سوگ کا دن تھا۔ ماتم کا دن...... عمر نے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا تھا۔ پاپا، ممی، میرے بہن بھائی دونوں چچا اور ان کی فیملیاں سب وہاں تھے۔ اس نے پاپا کو کہا پتا ہے کیا کہا تھا۔

"سنبھالیں اپنی بیٹی کو۔ پیچھے پڑی ہوئی ہے میرے۔ ارے، وہ تو میں ہی اسے گھاس نہیں ڈالتا ورنہ یہ تو اب تک پتا نہیں کیا کچھ چکی ہوتی۔ پھر پتا ہے میں نے کیا کیا تھا؟" وہ خاموش ہوئی تو دو آنسو لڑھک کر گالوں پہ بہہ نکلے زینی اٹھ کر اس کے پاس

بیٹھ گئی۔

"میں نے اسے ایک تھپڑ مارا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی ممی اور پاپا پہ چھوڑ دیا۔ والدین جو کرتے ہیں کم از کم ہم اولاد سے بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔"

اریشہ کے ہاتھ زینی کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اس بہادر لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس نے اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی خود کو تلخ نہیں کیا تھا، لہجہ وہی تھا شیریں، محبت بھرا...... نرم گرم سا۔ پھپھو بھی بہت بہادر تھیں جنہوں نے تلخ حالات میں ہمت نہیں ہاری اور اپنا سارا زیور بیچ کر اپنے شوہر کو دوبارہ کاروبار کرادیا۔ بلاشبہ آج زوہیب پھوپھا ایک کامیاب بزنس میں تھے اور اس کے پیچھے ایک مضبوط عورت کا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ پھپھو کو آئے ایک ماہ ہوگیا تھا اور انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا۔ گھر میں اب رونق لگی رہتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پہ اب تین افراد کے بجائے سات افراد ہوگئے تھے۔ حمزہ اپنی مصروفیات میں رہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی حماد بھی......

زینی، اریشہ اور علیشا کو کہیں نہ کہیں لے کر جاتی رہتی تھی کہ کہیں وہ بور ہی نہ ہو جائیں۔ آج بھی وہ ابھی گھر آئی تھیں۔ شام اتر رہی تھی باغیچے میں ہر سو گلابی پن چھایا ہوا تھا۔ آج پھر اس نے پاپا اور پھپھو کو برہان کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ پاپا کو اپنے بھتیجے سے بہت سی امیدیں تھیں۔ شاید......

جب بھی وہ اس شخص کا ذکر سنتی اس کا دل اداسی کے سمندر میں غوطے لگانا شروع کر دیتا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی اسے خود سے مخاطب نہیں کیا تھا اور اگر کرتی تب بھی خشک مزاجی سے جواب دیتا۔ کیوں کرتا تھا وہ ایسا؟ زینی کبھی نہیں جان پائی تھی۔ کتنی ہی دیر سے کھڑی وہ یہی سوچے جا رہی تھی بے وجہ...... خیالات کو جھٹک کر وہ وارڈروب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹانے لگا زور زور سے۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا بات ہے پھپھو! آپ......" وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔ پھپھو کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"زینی! جلدی آؤ۔ تمہارے بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" وہ انتہائی عجلت میں باہر کی سمت بھاگی۔ خوف، ڈر، وحشت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ گھر میں مرد کوئی بھی نہیں تھا سوائے داؤد صاحب کے۔

☆☆☆

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ ہاسپٹل کے کوریڈور میں سر ہاتھوں میں دیے بس خاموش آنسو بہائے جا رہی تھی۔ حمزہ کو فون کر کے اس نے وہیں بلا لیا تھا، کیا ہو رہا تھا، کیا کرنا تھا اسے کچھ علم نہیں تھا بس وہ یہ جانتی تھی کہ داؤد صاحب کو سی سی یو میں ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ باقی کی بھاگ دوڑ حمزہ کر رہا تھا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چچا کو فون کر دیا گیا تھا لیکن وہ ابھی تک پہنچے نہیں تھے۔ پھپھو اس کے ساتھ ہی بینچ پہ بیٹھی اسے حوصلہ و ہمت کرنے کی نصیحت کر رہی تھیں۔ حماد کو گھر اریشہ اور علیشا کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا، شیشے کے اس پار داؤد صاحب کا وجود بے حس و حرکت پڑا تھا۔

کتنی گھڑیاں بیتیں، کتنے گھنٹے گزرے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اندھیرا چھا رہا تھا، وہ واپس بینچ پہ آ بیٹھی تھی۔ وہ سن دماغ کے ساتھ بیٹھی تھی جب اسے چچا صاحب تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دکھائی دیے وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھپھو وہاں نہیں تھیں شاید کہیں گئی تھیں۔ حمزہ ڈاکٹروں سے الجھ رہا تھا۔ وہ حسین صاحب کے سینے پہ سر رکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ چچا اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب کیسے ہیں بھائی۔ کچھ بتایا تمہیں ڈاکٹرز نے؟" حسین

صاحب اس سے الگ ہوئے اور حمزہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حسین صاحب کے جانے کے بعد ان کے عقب میں کھڑے برہان پہ نظر پڑی تو وہ دنگ رہ گئی۔ خونی رشتوں سے محبت فطری بات ہوتی ہے۔ خون جو واقعی پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے تایا ابا کی محبت میں چلا آیا تھا، توقع کے خلاف چچی نہیں آئی تھیں۔ برہان نے اس سے کوئی بات نہیں کی نہ ہی اس نے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے وہاں بینچ پر بیٹھ گئی۔

"عابدہ نہیں آئی؟"

"میکے میں کوئی فنکشن ہے اسے اٹینڈ کرنا تھا اس لیے۔"

"لیکن اسے آنا چاہیے تھا۔" وہ چونکی، اس کے ساتھ بیٹھی عائشہ کو عابدہ چچی کے نہ آنے کا دکھ تھا۔ ان کی بات سن کر دل اور بھی ویران ہو گیا۔

صبح کے قریب داؤد صاحب خطرے سے باہر آ گئے تھے۔ ہر طرف جیسے روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ خوش تھی بے حد خوش۔ داؤد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی روتی رہی۔ حسین صاحب نے اسے اور حمزہ کو گھر بھیج دیا کہ رات کے تھکے ہوئے تھے۔ گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ وہ فجر کے وقت سوئی تھی سو جلدی آنکھ نہ کھل سکی۔ وہ صبح بہت سنہری، نرم گرم سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ہسپتال چلی گئی کہ جا کر پھپھو اور چچا کو گھر بھیجنا تھا۔ حمزہ اس کے ساتھ تھا۔ ہسپتال میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ڈاکٹرز اور نرسیں ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ داؤد صاحب کو پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ حسین چچا، عائشہ پھپھو اور داؤد صاحب حتیٰ کہ برہان بھی وہاں خاموش بیٹھے تھے۔ برہان ابھی تک یہیں تھا وہ گیا نہیں؟ اسے حیرانی ہوئی۔

داؤد صاحب بہت کمزور اور بوڑھے لگنے لگے تھے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا کیوں؟ عام طور پر کسی بڑی پریشانی کے باعث ہارٹ اٹیک ہوتا ہے لیکن انہیں کیا پریشانی تھی؟ وہ بس سوچ رہی تھی۔ پھر وہ ہوا جس کا اس نے گمان بھی نہ کیا تھا۔ برہان سے نکاح اوہ خدایا! لمحے بھر میں سب کچھ بدل گیا۔ برہان کی چبھتی نگاہیں، سب کی خاموشی اسے سب سمجھ میں آنے لگا۔" داؤد صاحب کی یہ پریشانی تھی اس کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا۔ وہ رونا چاہ رہی تھی لیکن رو نہیں سکتی تھی۔ بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن بھاگ نہیں سکتی تھی کیا کرے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہسپتال میں ہی نکاح ہو گیا۔

وہ ایک پل میں ہی زینب داؤد سے زینب برہان ہو گئی۔ وہ ابا سے ملنے ان کے کمرے میں گئی۔ برہان اب بھی اسے ایسے ہی گھور رہا تھا جیسے زبردستی یہ سب کروایا ہو۔ البتہ ابا، چچا اور پھپھو کی خوشی چہرے سے ہی چھلک رہی تھی۔ یہاں تک کہ حمزہ بھی بہت خوش تھا۔ وہ حمزہ کے ساتھ واپس گاڑی میں آ بیٹھی اسے گھر جانا تھا اب۔

"برہان خوش نہیں ہے لیکن آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اپنی خالہ زاد سے منسوب تھا شاید اس لیے۔" اس نے پوچھا نہیں تھا حمزہ خود ہی بتانے لگا۔ آخری بات پہ چونک کے اس نے اسے دیکھا۔ پھر گردن موڑ کے باہر دیکھنے لگی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"کیا ہوا؟ تم خوش نہیں ہو؟" حمزہ اس کی خاموشی پر فکر سے پوچھنے لگا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" کئی آنسو اپنے اندر اتارے۔ مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ زبردستی کسی کے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑ دیا گیا تھا خوش کیسے ہوتی بھلا! خیر! سچ وہ بول نہیں سکتی تھی اور جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی الٹا سوال کر دیا۔

"دیکھو زینی! میں تمہارا بھائی ہوں۔ لیکن بھائی سے پہلے میں تمہارا دوست ہوں۔ گہرا دوست۔ بیسٹ فرینڈ۔ تم پہلے بھی مجھ سے باتیں شیئر کرتی تھیں

"اور اب بھی مجھ پہ یقین کر کے مجھے سب بتا سکتی ہو جو تم کہنا چاہتی ہو۔ بولو! کیا بات ہے۔"

وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اس نے گردن موڑ کے حمزہ کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"حمزہ! برہان کے دل میں ہمیشہ ہمارے خلاف نفرت ہی پیدا کی ہے چچی نے۔ وہ اب بھی ہم سے نفرت ہی کرتا ہے اور تم دیکھنا وہ ہمیشہ مجھ سے نفرت کرتا رہے گا۔" لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس کے آنسو بہہ نکلے۔ حمزہ نے جیسے افسوس سے اسے دیکھا۔

"احمق لڑکی۔"

"اوہ زینی! اگر ایسی بات ہوتی تو وہ تایا ابا کی طبیعت خرابی کا سن کر دوڑا نہ چلا آتا بھی تو چچی کے ساتھ جا سکتا تھا فنکشن میں۔ پر وہ نہیں گیا اسے فکر تھی ابا کی، اسی لیے وہ یہاں آ گیا۔" حمزہ نے تفصیل سے اسے سمجھایا۔

"حمزہ! چچی نے ہمیشہ ان کو ہم سب سے دور رکھا ہے۔ اور تم دیکھنا اب بھی وہ ایسا ہی کریں گی۔ وہ اپنی بھانجی کی جگہ مجھے کبھی قبول نہیں کریں گی اور اب تم یہ مت کہنا کہ برہان کے ساتھ زبردستی نہیں کی گئی۔" وہ گھر پہنچ گئے تھے۔

"زینی! چچی نے ہمیشہ انہیں دور رکھا یہ بات میں مانتا ہوں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ لوگ مع فیملی یہاں گاؤں میں اس حویلی میں شفٹ ہو رہے ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتا گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے لگا۔ اس کی بات نے زینب کو چونکایا۔ وہ گاڑی سے اتری اور اندر جانے کے لیے مڑی۔ حمزہ نے اسے عقب سے پکارا۔

"رہی بات برہان کی۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تحمل سے کہنے لگا۔ "تو تم ایک بہت اچھی اور بہادر لڑکی ہو۔ اس کی ناپسندیدگی و نفرت کا آسانی سے مقابلہ کر لو گی۔"

چاروں طرف شام اتر رہی تھی لیکن ابھی کچھ اجالا باقی تھا اس کے دل میں۔

حمزہ کو کتنا یقین تھا اس پہ۔ اتنا تو خود اسے نہیں تھا۔ ایک دو دن میں داؤد صاحب بھی ڈسچارج ہو جائیں گے چلو خیر! ابا آ جائیں گے تو چچی کے طنز و طعنے کا مقابلہ بھی کر ہی لے گی۔ تمام سوچوں کو جھٹک کر وہ زینے چڑھنے لگی۔ دو دن سے ٹھیک سے اریشہ سے بات بھی نہیں ہو سکی تھی آخر کو ہونے والی بھابھی تھی۔

☆☆☆

عابدہ بیگم اپنے بھتیجے کی منگنی کے فنکشن سے رات گئے واپس آئی تھیں۔ داؤد صاحب کو ایک دن بعد ڈسچارج کیا جانا تھا۔ برہان اور حسین صاحب گھر آ گئے تھے۔

برہان قدرے مضطرب تھا اور حسین صاحب مطمئن، وہ دونوں آتے ہی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ عابدہ بیگم کو جب سے نکاح کا علم ہوا تھا وہ پورے گھر میں غصے سے دندناتی پھر رہی تھیں۔ سمیرا دل ہی دل میں خوش تھی لیکن ماں کے غصے سے خائف اپنی خوشی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ نے اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بنا کیا بھی کیسے؟ آپ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ آپ کی ایک بیوی بھی ہے، اس کی رائے بھی اہم ہے۔ لیکن نہیں جو دل کرتا ہے وہ کرتے ہیں آپ!" وہ انتہائی غصے سے ہاتھ نچا نچا کر بول رہی تھیں، آواز قدرے اونچی تھی۔ حسین صاحب نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر لیپ ٹاپ پہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

"اور آپ کو میں نے بتایا تھا نا کہ میں نے زاہدہ آپا کو زبان دی ہوئی ہے اس کے باوجود آپ نے اس اسٹویڈ لڑکی سے برہان کا نکاح کر دیا جسے میں تو کیا برہان بھی ناپسند کرتا ہے۔" وہ غصے سے نفرت میں ڈوبے لہجے سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اس وقت سب بھول گئی تھیں۔ شوہر کا ادب، عزت و احترام سب کچھ یاد تھا تو صرف اپنی بہن سے کیا وعدہ...... "اور میں

نے بھی یہ کہا تھا کہ میں زینب کو پسند کرتا ہوں برہان کے لیے۔'' وہ انتہائی ضبط سے بولے نگاہیں اب بھی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ ان کا یہ انداز...... عابدہ بیگم کے تو تلووں پہ لگی سر پہ بجھی۔

''اور میں اس جاہل لڑکی کو اپنی بہو قبول نہیں کر سکتی فار گاڈ سیک!'' انتہائی بدتمیزی سے چلاتے ہوئے کہا۔

''بس! خاموش ہو جاؤ۔ تم نے ہمیشہ اپنی مرضی کی ہے وہ کیا جس میں تمہیں خوشی ملے۔ سمیرا کا رشتہ اپنے بھائی حمید کے بیٹے ارسل سے طے کر دیا۔ میں نے اعتراض کیا؟ تم مجھے میرے بھائی سے دور شہر اپنے میکے کے قریب لے آئیں، اپنے بچوں کو میرے بھائی، بچوں سے دور رکھا۔ کبھی میں نے اس بات پر اعتراض کیا بتاؤ! نہیں کیا ناں، تو پھر اب تم میرے فیصلے پر کیوں کر اعتراض کر سکتی ہو۔'' وہ چلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عابدہ سہم سی گئیں۔ اپنے شوہر کو پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

''آپ...... آپ کی جاب بھی شہر میں...... میرا مطلب یہاں تھی اور برہان کی جاب بھی اسی علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ہے۔'' تر زبان خشک ہونٹوں پر پھیرتے وہ بمشکل کہہ پائیں۔ حسین صاحب نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

''میں نے ریزائن دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہاں بھائی کا کاروبار سنبھالوں گا جا کر۔'' وہ چبا چبا کر بولے۔ عابدہ کے چہرے کی رنگت پہلے بھی زیادہ پھیکی پڑ گئی۔

''ہم گاؤں نہیں جائیں گے۔ پہلے ہی اس Mess کی وجہ سے ہماری اچھی بھلی زندگی ڈسٹرب ہو کے رہ گئی ہے، اب رہی کسر یہاں سے وہاں شفٹ ہو جانے سے پوری ہو جائے گی۔ میں اور بگاڑ نہیں چاہتی اپنی زندگی میں۔'' وہ انتہائی ضبط سے قدرے اونچی آواز میں بولیں۔ برہان اور زینب کا نکاح عابدہ کی نظر میں کھٹک تھا یہ بات حسین کا دماغ گھمانے کے لیے کافی تھی۔

''تم چاہو تو یہاں رہ سکتی ہو اپنے میکے میں۔ میں اور میرے بچے کل ان شاء اللہ گاؤں شفٹ ہو جائیں گے۔'' انتہائی حقارت سے کہتے وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔

عابدہ جو وہاں صوفے کے پاس کھڑی تھیں کھڑی نہیں رہ سکیں۔ بیٹھ گئیں۔ آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔

☆☆☆

صبح کی شفاف کرنوں نے پورے حسین ہاؤس کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ گھر کے تمام افراد اپنے اپنے معمول کے کاموں میں مشغول تھے۔ عابدہ بیگم کا چہرہ ستا ہوا تھا یقیناً رات کی تمام باتیں انہیں ازبر تھیں۔ حسین صاحب خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے۔ انابیہ اور ارمان اپنے اپنے اسکول جا چکے تھے۔ برہان شاید ابھی تیار ہو رہا تھا۔ سمیرا اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئی وہ آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں برش پھیر رہا تھا۔

''ہائے برہان! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنی خوش ہوں۔ پاپا نے بہت اچھا فیصلہ کیا تم دونوں کا نکاح کر کے۔ یو نو برہان! زینی ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہیں کبھی مایوس......'' برہان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے اور یہ بات بھی تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ میں رامین میں انٹرسٹڈ ہوں۔ ہے نا! جلد یا بدیر رامین میری زندگی میں شامل ہو جائے گی۔ آئندہ میرے سامنے یہ زینب نامہ مت شروع کرنا۔'' وہ غصے میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ غصہ برہان کی آنکھوں میں واضح تھا۔

''کیا مطلب؟ تم...... زینی کو...... اپنی زندگی سے......'' بے یقینی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''نکال دوں گا۔ بالکل نکال دوں گا۔'' اس کا ادھورا جملہ برہان نے ادا کیا۔ اتنی نفرت کرتا تھا وہ زینب سے......

"کیوں؟ تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟" اس کا لہجہ کمزور تھا۔ برہان خاموش رہا۔ وہ اب الماری سے اپنے ضروری کاغذات نکال رہا تھا۔

"تمہیں اور پاپا کو کیا لگتا ہے کہ میں ایک جاہل اور اسٹوپڈ لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزار لوں گا وہ بھی آپ دونوں کو خوش کرنے کے لیے۔ نہیں سمیرا پلیز میں ایسا نہیں کرسکتا۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے کہتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ اتنی نفرت کیوں کرتا ہے زینب سے کیوں؟ یہ سوال وہ خود سے پوچھتی الجھ رہی تھی۔ ہر چیز پر جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ وہیں الماری کے پاس کھڑی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

☆☆☆

"عابدہ! جب ایک لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ صبر کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھر کو چھوڑ کر ایک بالکل پرائے گھر میں آجاتی ہے۔ صرف اور صرف اپنے شوہر کے لیے جس سے اسے جوڑ دیا دیا جاتا ہے۔ وہ وقت ایسا ہوتا ہے جب سب اس کے لیے اجنبی ہوتے ہیں وہ جانتی ہے تو صرف اپنے شوہر کو۔" عابدہ بیگم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے وہ اس قدر نرمی سے بول رہے تھے کہ جیسے ایک دن پہلے کوئی تلخ کلامی نہ ہوئی ہو۔

"تب اس عورت کو چاہیے کہ وہ صرف اور صرف اپنے شوہر سے محبت کرے میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اسے اپنے والدین بہن بھائیوں سے نفرت کرنی چاہیے۔ بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے اپنے سسرال میں تعلقات بڑھانے چاہئیں۔" ڈائننگ روم کی ایک کھڑکی جوان کی طرف کھلتی تھی اس سے روشنی چھلک رہی تھی۔ عابدہ بیگم خاموشی سے اپنے شوہر کو سن رہی تھیں۔

"ہم آج شام کو گاؤں چلے جائیں گے۔ میں نے ایک غلطی کی تھی اب اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتا۔ وہاں تمہیں اور بچوں کو ہر آسائش ملے گی جو یہاں ملتی ہے۔ ٹھیک!" وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عابدہ بس انہیں جاتا دیکھتی رہیں کہا کچھ نہیں۔

"میں امید کرتا ہوں کہ مسز عابدہ حسین میرے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کریں گی۔" چوکھٹ پر کھڑے ہو کر وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ انہوں نے بھی پھیکی مسکراہٹ سے شوہر کا ساتھ دیا۔

☆☆☆

شام کا گلابی پن ہر سو اترا ہوا تھا۔ سورج کا گولا بس ڈوبنے کو ہی تھا۔ حسین صاحب اور ان کی فیملی اپنے ساز و سامان کے ساتھ سرخ حویلی کے سامنے بنی اینٹوں کی سڑک پر کھڑی تھی۔ چوکیدار نے جھٹ سے تابعداری کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ گھر کے تمام مکین استقبال کے لیے تیار تھے ماسوائے زینب کے، طبیعت کی خرابی کے باعث وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ اریشہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی۔

"زینی! اٹھو جلدی سے، چھوٹی ممانی اور ماموں آگئے ہیں۔" وہ اسے جھنجوڑ کے اٹھا رہی تھی۔ زینب ہڑبڑا کے اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نکلی تو چہرہ دھلا ہوا اور آنکھیں خمار آلود تھیں۔

"کہاں ہیں؟" آہستہ آواز میں اریشہ سے پوچھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آؤ جلدی سے، وہ ابھی تو پورچ میں ہی ہوں گے۔" وہ اسے لیے تیزی سے باہر نکلی۔

"زینی! تم جانتی ہو نا کہ اب تمہارا ان سے رشتہ بدل گیا ہے۔ تمہیں ان کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا ہوگا ورنہ....." زینب تو اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی بات پر سر ہلا کر رہ گئی۔

"زینی! طبیعت کیسی ہے اب تمہاری، آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔" اریشہ ٹھہر کے اس سے پوچھنے لگی۔ زینب جانتی تھی کہ وہ موضوع بدلنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہے۔

"ہاں، پہلے سے کافی بہتر ہے۔ بس سر میں ہلکا درد ہے۔ بخار تو تقریباً اتر گیا ہے۔" اس نے تفصیلا

کہا۔ دونوں اب ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی تھیں۔ سب سے ملنے کے بعد وہ دونوں بھی ایک طرف سمیرا کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''آپ کا سفر کیسا رہا بھابھی!'' پھپھو، عابدہ بیگم سے مخاطب تھیں۔ جواب قدرے پرسکون لگ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں آنے سے پہلے ان کے چہرے پر موجود بےزاری غائب ہو چکی تھی۔

''پھپھو میں آتی ہوں ابھی۔'' وہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھی۔ جس کا انتظار تھا وہ شاید باہر ہو۔

''بھائی! برہان کیوں نہیں آیا۔'' پھپھو نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔

اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔

''عائشہ! وہ رات کو آئے گا۔'' چوکھٹ عبور کرتے ہوئے اسے چچا کی آواز سنائی دی۔ وہ کچن میں آ گئی جہاں زبیدہ خاتون مہمانوں کے لیے مختلف لوازمات ٹرالی میں سجا رہی تھیں۔ وہ ٹرالی دھکیلتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

ان ہی سوچوں میں غلطاں وہ اندر داخل ہوئی۔ چچا بابا کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور چچی خاموش ہی تھیں۔ سمیرا اور اریشہ دونوں محو گفتگو تھیں جبکہ انابیہ خاموش...... ارمان حمزہ کی بغل میں بیٹھا تھا اور اس کے بائیں جانب حماد، صرف دو افراد وہاں نہیں تھے۔

''عائشہ! تمہاری بات ہوئی زوہیب بھائی سے کب آئیں گے وہ۔''

وہ چائے دے رہی تھی سب کو، تب اس کے کانوں سے عابدہ چچی کی آواز ٹکرائی۔ ان کا لہجہ عجیب تھا وہاں بیٹھا ہر شخص ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھپھو کچھ شرمندہ سی بھی تھیں۔ اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

''چچی! وہ چار ماہ بعد آئیں گے اور بابا نے کہا ہے تب تک یہ یہیں رہیں گی۔ ان کے یہاں رہنے سے ہمارا گھر پررونق ہو گیا ہے۔'' اس نے چائے کا کپ ان کے سامنے کرتے ہوئے تحمل سے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ عابدہ پھیکا سا مسکرائیں۔

''زینب بیٹا! داؤد بھائی اپنے کمرے میں سو رہے ہیں؟'' حسین صاحب نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لیے زینب کو مخاطب کیا۔

''نہیں شاید وہ جاگ رہے ہیں۔'' وہ ان کی طرف گھومی۔

''ٹھیک ہے پھر میں ان کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی چائے ختم کر کے وہیں آ جاؤ۔'' وہ باہر کی طرف بڑھ گئے۔ پھپھو بھی اٹھ کر کچن میں آ گئیں۔ ان کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ سب وہاں سے چلے گئے۔ وہ بھی اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ جانتی تھی پھپھو کام کر رہی ہوں گی۔

''پھپھو پلیز۔ آپ مما کی باتوں کا برا مت مانیے گا۔'' وہ ابھی باہر ہی تھی جب اس کے کانوں سے سمیرا کی آواز ٹکرائی جو پھپھو کے ہاتھ تھامے شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔ پھپھو مسکرا دیں۔

''نہیں میرے بچے! برا ماننے والی تو کوئی بات نہیں کہی تھی انہوں نے اور تم بالکل بھی شرمندہ مت ہو۔ جاؤ آپ اپنے بابا کے کمرے میں جا کر بیٹھو۔'' پھپھو نے اس کا گال تھپتھپایا۔ زینب اسی وقت اندر داخل ہوئی۔

''پھپھو! آپ یہاں کیوں کام کر رہی ہیں؟'' آپ بابا کے کمرے میں جائیں، سب وہاں بیٹھے ہیں گپ شپ لگائیں۔ کھانا زبیدہ خاتون خود بنا لیں گی۔'' وہ پھپھو کے پاس جا کر کھڑی ہوئی جو چاول دم پر رکھ رہی تھیں۔ پھپھو نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''بیٹا! میں تو صرف دیکھ رہی ہوں۔ کھانا تو زبیدہ نے ہی بنایا ہے اور ویسے بھی عورت جب تک کھانے میں چمچ نہ ہلائے اس کے بچوں کو کھانے میں ذائقہ نہیں آتا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا۔ زینب اب شیلف پر سلاد کے لیے رکھی سبزیاں کاٹ رہی تھی۔

''پھپھو! زبیدہ بھی تو عورت ہے۔'' اس نے جیسے پھپھو کو یاد دلایا۔

''نہیں میرے بچے! زبیدہ کے ہاتھ کے بنے کھانوں کا ذائقہ اس کے بچوں کو آئے گا۔ میرے ہاتھ کے بنے کھانوں کا ذائقہ آپ لوگوں کو آئے گا۔'' پھپھو اب اس کے ساتھ سبزیاں کٹوانے لگی تھیں۔ وہ جو توجہ سے ان کی بات سن رہی تھی سر ہلا کر رہ گئی۔

جلدی جلدی سلاد بنا کر وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر برتن سیٹ کرنے لگیں۔ اسی اثناء میں گاڑی کے ہارن کی آواز آئی اور پھر...... گیٹ کے کھلنے کی۔ اس کا دل اس پل زور سے دھڑکا۔ گھر کے تمام افراد بابا کے کمرے میں تھے تو آنے والا یقیناً برہان تھا۔

کچن اور لاؤنج کے درمیان تقریباً تین فٹ کی دیوار تھی (آدھی کھلی) اور کچن سے ملحقہ ہی ڈائننگ روم تھا جہاں وہ ٹیبل پر برتن لگا رہی تھی۔ لاؤنج سے گزر کر ڈرائنگ روم اور باقی کمروں میں جایا جاتا تھا۔ گاڑی اب پورچ میں پہنچ گئی۔ وہ ساتھ ساتھ کام کرتی اور کن انکھیوں سے لاؤنج کی طرف بھی دیکھتی۔ عین اسی وقت شیشم کی لکڑی کے بنے لاؤنج کے بھاری دروازے میں چرچراہٹ پیدا ہوئی اور اس کا دل زور سے دھڑکا۔ پھپھو بھی آواز کو لاؤنج میں چلی آئیں اور خوش اخلاقی سے اس کا استعمال کیا۔ زینب وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ نظروں کی تپش محسوس کر کے برہان نے بھی اس کی طرف دیکھا اور بےزاری سے منہ پھیر لیا۔ زینی گڑبڑا کر جلدی جلدی کھانا لگانے لگی۔

وہ پولیس یونیفارم میں اس کی سوچ سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کی سیاہ خوب صورت گہری آنکھیں۔ اٹھی ہوئی مغرور ناک چہرے کے واضح نقوش وہ واقعی بہت ہینڈسم تھا۔ زینب نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اس کی بےزاری جانچ چکی تھی۔

کچھ دیر بعد سب ڈائننگ روم میں آنا شروع ہو گئے سب اپنی اپنی کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ داؤد صاحب کو بھی لایا گیا تھا۔ وہ سربراہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں طرف حسین صاحب اور بائیں طرف عابدہ بیگم، پھپھو حسین چچا کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ زینب آداب میزبانی ادا کر رہی تھی۔ جس کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ اسے دیتی۔ کچھ دیر بعد وہ آتا دکھائی دیا۔ اب اس نے نیلی جینز کے اوپر گہرا نیلا سوئیٹر پہنا ہوا تھا۔ بال سلیقے سے ماتھے پر جمائے ہوئے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے داؤد صاحب کی طرف بڑھا یقیناً وہ ان سب سے اب مل رہا تھا۔

''زینب! اس جگ میں پانی لے کر آنا۔'' ابھی اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سالن کے باؤل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چچی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ سر ہلا کر جگ لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھپھو اٹھ کر برہان کو کھانا پیش کرنے لگیں۔ عابدہ نے جان بوجھ کر اسے بھیجا تھا وہاں بیٹھے ہر سمجھ دار شخص نے اس بات کو نوٹ کیا تھا۔ وہ خاموشی سے جگ میں پانی ڈالنے لگی۔ آج ٹھنڈ ضرورت سے زیادہ تھی ہڈیوں کو چٹخا دینے والی۔

☆☆☆

''رات کی ڈوز نہیں لی نا آپ نے بابا!'' وہ داؤد صاحب کے پاس کھڑی ان کی دوائیاں چیک کر رہی تھی۔

''زینب! میری جان! ادھر آؤ میرے پاس۔'' داؤد صاحب محبت سے چور لہجے میں اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔

''ڈیرسٹ فادر! پہلے آپ اپنی دوائی لیں۔ پھر میں آپ کی پوری بات توجہ اور مکمل یکسوئی سے سنوں گی ٹھیک!'' ایک گلاس میں پانی انڈیل کر انہیں دیا اور دوسرے میں دوائی۔

''بولیں بابا! کیا بات ہے۔'' گلاس ان سے لیتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔ ''اپنے چچا کی فیملی کو ان کے کمرے دکھا دیے تھے۔'' وہ فکرمندی سے بولے۔ زینب جانتی تھی کہ یہ ان کا موضوع گفتگو نہیں ہے۔ تمہید ہے۔

''تمہید کو کٹ کریں بابا! مدعے پر آئیں جو آپ کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔'' اس نے ان

کے کمزور ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں میں تھام لیے۔

''زینب! کچھ دن پہلے میں نے تمہاری رضا مندی پوچھے بغیر ہی تمہاری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ.....''

''مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ ہے ناں!'' ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ سنجیدگی سے بولی۔

''بابا! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آپ ہی کو اپنے لیے پریشان اور فکر مند ہوتے دیکھا ہے۔ میری کل کائنات آپ اور حمزہ ہیں۔ آپ کا ہر فیصلہ مجھے قبول ہے۔'' وہ سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بول رہی تھی۔

''میری بیٹی تو بہت سمجھ دار ہوگئی ہے میں خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا تھا۔'' انہوں نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو حلق میں اتارتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔

''بابا! جو میرے حق میں بہتر ہوگا اللہ تعالیٰ وہی کرے گا کیونکہ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور آپ بھی میرے لیے زیادہ پریشان مت ہوا کریں مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

لاؤنج اور برآمدے کی ساری بتیاں گل تھیں صرف ایک جل رہی تھی۔ وہ اندھیرے میں چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ داؤد صاحب کے کمرے کے دائیں طرف حمزہ کا کمرہ تھا اور بائیں طرف حسین صاحب کا۔ حسین چچا کے کمرے کے ساتھ والا برہان کا تھا۔ برہان کے کمرے کے بعد اس کے کمرے کا نمبر تھا۔ اسے اس کے کمرے کے سامنے سے گزر کر جاتا تھا۔ وہ سست روی سے چلتی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اس سے ٹکرائی۔ سامنے برہان تھا۔

''اوہ! سوری۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکی۔'' وہ معذرت کرتی اس کے پہلو سے نکل کر آگے جانے لگی تب اپنے عقب سے اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''رات کو پہرے داری کی جا رہی تھی ہماری؟'' وہ سخت لہجے میں چبا چبا کر بول رہا تھا۔ زینب کو اپنا اعتماد دھواں ہوتا نظر آیا پھر بھی خود اعتمادی سے پلٹی۔

''میں ابھی بابا کے پاس سے آئی ہوں۔ ویسے اتنی رات کو آپ کو کچھ چاہیے تھا۔'' وہ بھی زینب داؤد تھی سو جتا گئی کہ وہ اتنی رات کو کمرے سے باہر کیا لینے نکلا تھا۔ وہ سر جھکا گیا۔

''کیا چاہیے آپ کو؟'' اس کی خاموشی پر زینب نے دوبارہ پوچھا۔ لہجہ البتہ نرم تھا۔

''مجھے پانی چاہیے تھا۔ میں خود لے لوں گا کچن سے'' سنجیدگی سے کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔ زینب کو ڈھیروں شرمندگی ہوئی اسے پانی رکھنا چاہیے تھا برہان کے کمرے میں۔

''برہان! میں ابھی لاتی ہوں پلیز۔'' تیزی سے آگے بڑھی اور قریباً دوڑتے ہوئے نیم اندھیرے میں آگے بڑھ گئی وہ پلٹا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دستک کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ لیپ ٹاپ میں کچھ کام کر رہا تھا پانی کا جگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

''تھینکس! ویسے تم Courteous ہو یا......'' وہ اسکرین پر نظریں مرکوز کیے مصروف انداز میں بولا۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کر گئی۔ شاید اب ہمیشہ اسے اس شخص کے سامنے جھکنا تھا اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اسی خاموشی سے چوکھٹ پار کر گئی۔

☆☆☆

صبح کا دودھیا پن ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر ابھی اپنے کمرے میں واپس آیا تھا۔ ہر سو دھند بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ جاگنگ سوٹ پہن کر وہ کھڑکیوں کے پردے ہٹانے لگا تب اچانک بائیں طرف بنے باغیچے میں اس کی نظر پڑی۔ سیاہ لمبی قمیص کے نیچے چوڑی دار پاجامہ پہنے۔ اور سیاہ سوئیٹر پہنے، دوپٹہ نماز کی شکل میں چہرے کے گرد لپیٹے اس کی دودھیا رنگت اور بھی اجلی لگ رہی تھی۔ دھند میں لیکن پھر بھی وہ شیشے کے اس پار ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری لیے الجھی ہوئی چینی کی مورت کو بغور دیکھ سکتا تھا۔ وہ

آگے پیچھے پینڈولم کی طرح کیاری کے ساتھ پھر رہی تھی۔ بے اختیار وہ کئی لمحے اسے دیکھے گیا۔ وہ خوب صورت تھی واقعی خوب صورت تھی۔

''واؤ!'' بے اختیار برہان کے لبوں سے نکلا۔ پردے برابر کر کے وہ باہر کی طرف بڑھا۔

وہ اس کی خوب صورتی کو ماننے پر مجبور تھا۔ وہ شائستہ مزاج بھی تھی لیکن پھر بھی دل کے کسی کونے میں اس کے لیے ناپسندیدگی بھی موجود تھی، یہ اس کے خلاف کی گئی برین واشنگ تھی۔ وہ اب کانوں میں ہینڈ فری لگا رہا تھا۔ گاؤں شہر سے زیادہ دور نہیں تھا تقریباً تمام سہولیات ہی میسر آ گئی تھیں یہاں پھر بھی وہ گاؤں ہی تھا۔

سرخ ٹائلوں کی بنی روش پر اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے اور دوسری طرف زینب ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکری اٹھائے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے جاتا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکی اس کی ایک اور عادت کا پتا چل گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے لابی میں آ گئی جہاں ٹیبل پر صراحی کی شکل کے کئی گل دان رکھے ہوئے تھے۔ ان گل دانوں پر سنہری رنگت کا پینٹ کیا ہوا تھا۔ تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر ٹہنیوں سمیت پھول ان میں ڈالنے لگی۔ پھر ٹوکری اٹھائے لاؤنج میں آ گئی وہاں ٹیبل پر رکھے گل دان میں پھول رکھنے لگی۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح سے منہمک تھی۔

''واؤ زینی! یہ تو بہت پیارا لگ رہا ہے۔ تم روز ایسے ہی بناتی ہو؟'' سمیرا پیچھے کھڑی تحیر سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ستائش نمایاں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''صبح صبح اٹھ کر تازہ گلاب دیکھے جائیں تو یہ کتنا اچھا احساس ہوتا ہے اسی لیے میں یہ روز ہی کرتی ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی اور مصروف سے انداز میں ٹوکری اٹھائے ڈائننگ روم میں چلی گئی۔

''یہ والے میں کرتی ہوں۔'' سمیرا جھٹ سے آگے ہوئی اور ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلدانوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے بھی ٹوکری اسے تھما دی اور فریج سے سیب نکالنے لگی۔ زبیدہ ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔ اور وہ سیب چھیلنے میں۔ جبکہ تیسری لڑکی اپنی مکمل خوب صورتی کے ساتھ اپنے کام میں مگن تھی۔ جس نے کھلے سفید ٹراؤزر کے اوپر کھلی قمیص پہن رکھی تھی۔

''ہوگیا۔ یہ دیکھو ٹھیک کیا ہے ناں میں نے؟'' سمیرا اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی اس نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اب کیا کرنے لگی ہو؟'' وہ اس کے پاس ہی آ کھڑی ہوئی۔

''سلش (Slush) بنا رہی ہو؟'' اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہاں ویسے اب بھائی کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے؟ یقیناً وہ جاگنگ پر گئے ہوں گے؟'' سمیرا جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ برہان کے آنے سے پہلے ہی سمیرا کے ہاتھ اس کے کمرے میں جوس بھجوا چکی تھی۔ اور اب سب تقریباً جاگ چکے تھے۔ وہ پرہیزی ناشتے کی ٹرے اٹھائے داؤد صاحب کے کمرے میں چلی آئی۔

''زینی بیٹا! تم باہر ہی چلو، میں وہیں لے کر آ رہا ہوں بھائی کو۔'' بابا کے کمرے دروازے پر ہی اسے حسین صاحب مل گئے۔ وہ ٹرے اٹھائے ڈائننگ ہال میں چلی آئی جہاں تقریباً سب ہی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ فرائض میزبانی پھپھو ادا کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اریشہ اور سمیرا کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جس کے بالکل سامنے برہان ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں مسکراہٹ دبا گئیں۔ آنکھوں میں شرارت واضح تھی۔ اس کا تو مانو دل نوے کی اسپیڈ سے دھڑکنے لگا۔ اسے ان دونوں پر غصہ آنے لگا۔ داؤد صاحب بھی آ گئے تھے۔ برہان ناشتہ کر کے اٹھنے لگا تو چچی نے اسے مخاطب کیا۔

''برہان بیٹا! واپسی پر امین کو اپنے ساتھ لے آنا وہ مجھ سے آنے کا کہہ رہی تھی تو میں نے اس سے

کہاتم اسے لے آؤ گے۔ٹھیک ہے بیٹا!'' وہ عام سے لہجے میں کہہ رہی تھیں لیکن اس بات کی گہرائی سمجھنے والے سمجھ گئے تھے۔

☆☆☆

''زینی! تم اپنے گاؤں ہمیں کب گھمانے لے کر جارہی ہو پھر......؟'' سمیرا اس کے پیچھے چلی آئی جواریشہ کے پاس آئی تھی۔

''چلو ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے جھٹ کیا۔

''نہیں آج نہیں۔'' اریشہ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔

''کیوں؟'' بیک وقت دونوں کے منہ سے نکلا۔

''آج ہم لوگ گاؤں گھومنے بالکل بھی نہیں جائیں گے۔ بلکہ آج ہم پیزا کھانے جائیں گے کیونکہ بہت دن ہو گئے ہیں۔ بہت دل کر رہا ہے پیزا کھانے کا۔'' وہ بیڈ سے اچھل کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور دوپٹہ اسکارف حجاب کی صورت لپیٹنے لگی۔یعنی جانے کی تیاری کرنے لگی۔

''یار! ہم گھر پر ہی منگوا لیتے ہیں۔'' سمیرا نے جیسے مشورہ دیا۔

''کہاں یار گھر پر منگوائیں گے تو بور ہوں گے۔ وہاں کسی پیزا ہٹ میں قد آدم شیشے کی کھڑکیوں کے پاس بیٹھ کر کھانے کا تو اور ہی مزا ہے۔ ساتھ ساتھ سڑک پر رواں دواں ٹریفک اور لوگوں کی چہل پہل دیکھیں گے اور ساتھ ہی باتیں بھی کریں گے۔'' وہ دوپٹہ تقریباً اوڑھ ہی چکی تھی۔ وہ دونوں خاموش کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''میں ابھی ممی سے اجازت لے کر آتی ہوں، تم لوگ فٹافٹ تیار ہو جاؤ ٹھیک!'' وہ انہیں خاموش دیکھ کر باہر چلی گئی۔ وہ دونوں بھی مجبوراً اپنے اپنے کمروں میں آ گئیں۔ تیار جو ہونا تھا، زینی تیار ہو کر بابا کے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ اریشہ زینے اتر رہی تھی۔ فولڈ کرتا حماد اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

''حماد ہمارے ساتھ جا رہا ہے؟'' سمیرا نے اریشہ سے پوچھا۔اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''حماد بھی ڈرائیونگ کر لیتا ہے لیکن مجھے اس کی ڈرائیونگ پر بالکل بھی بھروسا نہیں ہے زینی! ڈرائیو تم نے ہی کرنا ہے۔'' اریشہ اسے متنبہ کر رہی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

''زینی آپا! چلیں۔'' حماد مسکراتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''تم نے کیوں منہ بسور رکھا ہے۔فکر نہ کرو میں آج دوسرے راستے سے لے کر جاؤں گی۔ آدھے سے زیادہ گاؤں کی سیر کر لو گی۔'' اس نے سمیرا سے کہا جس کا منہ اترا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی نہر کے ساتھ بنی اینٹوں کی سڑک پر رواں دواں تھی۔ شام اترنے والی تھی۔ سورج کا گولا اب ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں پانی پر پڑ رہی تھیں جس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے پانی میں کسی نے سونا ڈال دیا ہو۔ نہر کے دوسری طرف سرسوں کے بے تحاشا پھول کھلے ہوئے تھے اور دور پھولوں کے پار کھجور کے لمبے لمبے درخت لگ رہے تھے منظر انتہائی خوب صورت تھا۔ حماد سمیرا اور اریشہ محو سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

''سچ یار ہم جب آئے تھے تب ہم کہیں اور سے آئے تھے۔'' گاڑی اب شہر کی سیاہ روشن سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ جب سمیرا نے کہا۔

''ویسے سمیرا آپا! یہ رامین کون ہے؟ جس کا صبح ممانی ذکر کر رہی تھی۔'' حماد نے وہ سوال کیا جو زینی کو کھٹک رہا تھا۔ بس وہ پوچھنے سے ہچکچا رہی تھی۔

''یہ رامین...... رامین میری خالہ زاد ہے، مما کی لاڈلی۔'' اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہی رامین ناں جس سے ممانی برہان بھائی کی شادی کرنا چاہتی تھیں رائٹ۔'' حماد نے رخ موڑتے ہوئے سمیرا سے پوچھا۔ اریشہ نے اسے تادیبی نظروں سے گھورا کہ زینب کے سامنے ایسے سوال۔

''اوہ ہم جا تو رہے ہیں۔ اگر ہمیں برہان بھائی ل گئے تو سچی بہت انسلٹ ہوگی ویسے اس ٹائم تک تو وہ فری ہوتے ہیں۔'' سمیرا پریشان سی کہہ رہی تھی اس کی بات سن کر وہ دونوں بھی کچھ فکرمند ہو گئیں۔

''ارے آپ تینوں پریشان نہ ہوں میں ہوں نا آپ کے ساتھ آپ تینوں کا محافظ۔'' حماد نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اک ادا سے کہا۔ تینوں بے ساختہ ہنس دیں اب وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے وہاں کافی رش تھا۔

''آپ لوگ اندر جائیں میں گاڑی پارک کر کے آجاتا ہوں۔'' گاڑی سے اتر کر وہ تینوں اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئیں اور اریشہ نے مینو کارڈ اٹھا لیا۔ اریشہ فٹافٹ آرڈر کر رہی تھی۔ سمیرا جو شیشے کے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی حماد کے انتظار میں، گھبرا گئی۔ وہ بالکل شل سی دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی زینب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ اریشہ جو مگن سی بیٹھی تھی انہیں دیکھ خود بھی حیران رہ گئی۔ برہان ان کی طرف ہی آرہا تھا چہرے کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ لب بھنچے ہوئے۔

''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ غصے سے چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

''بھائی وہ ہم......'' اریشہ اٹک رہی تھی۔ برہان کا غصہ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''یقیناً تم یہاں لائی ہو گی ان کو۔ تمہیں ذرا بھی حیا ہے جیسی تم خود ہو ویسا ہی ان کو کرنا چاہتی ہوں؟'' وہ زینی کی طرف گھوما اور غصے سے چابک مارنے لگا جو اس کے دل و دماغ کو زخمی کر رہے تھے۔

''نہیں بھائی! زینی...... ہمیں یہاں...... نہیں......'' سمیرا اس کے دفاع میں بولنے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

''تم جانتی ہو زینب! کہ تم ایک شریف مرد کے نکاح میں ہو اور تمہیں یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ جیسی تم آوارہ ہو، ویسی ہی دوسروں کو کرو گی تو میں بالکل بھی برداشت......'' وہ اس کی سماعت پر مسلسل کوڑے برسا رہا تھا۔

''شریف مرد! مائی فٹ۔ تم خود کو شریف مرد کہتے ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی شرافت ہوتی تو یہاں سرعام اپنی بیوی، بہن اور پھپھو زاد کا تماشا نہ لگاتے اور میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ یہ شریف مرد ضرور یہاں کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر آیا ہوگا۔ اور ایک بات یاد رکھنا مسٹر برہان حسین! آج کے بعد کبھی میرے منہ مت لگنا۔ چلو حماد یہاں سے۔'' کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ برق رفتاری سے وہاں سے جا رہی تھی، آخری بات جو اس نے سنی وہ یہ تھی۔

''بھائی! ان تینوں کو یہاں میں لایا تھا۔'' حماد قدرے اونچی آواز میں بولا۔ وہ سختی سے اپنے رخساروں کو رگڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اتنی تضحیک، اتنی توہین، زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی اس کی اور وہ بھی اس شخص سے جس سے اس نے محبت کی تھی۔ جب تک وہ تینوں وہاں آ کر بیٹھے، وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اندھیرا تقریباً ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ ایسا ہی اندھیرا اس کے دل کے ہر خانے میں پھیل گیا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتار سے گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ آنکھیں سرخ، متورم چہرہ، سرخ ناک وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

''بھائی واقعی کسی لڑکی کے ساتھ آئے تھے وہاں؟'' اریشہ کی افسوس بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''رامین......'' یک لفظی جملہ سمیرا کا تھا۔

''اچھا تو یہ ہے رامین! مائی فٹ!'' حماد کا غصے سے برا حال تھا۔ بارش کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ونڈ اسکرین سے ٹکرا رہی تھی۔ ہوائیں سرپٹخ پٹخ کر واپس جا رہی تھیں۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کمرہ لاک کر لیا۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے اپنے

کمروں میں چلی آئیں۔

☆☆☆

”برہان! تمہیں ذرا بھی میرا یا خالہ جان کا خیال نہیں آیا، کیسے خاموشی سے بالکل نارمل انداز میں تم نے اپنی تایازاد سے نکاح کرلیا۔“ رامین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ برہان غائب دماغی سے اسے سن رہا تھا۔ دماغ میں تو بس زینب کا وہ غصے بھرا انداز رہ گیا تھا۔ اس کی بھیگی آنکھیں......

”برہان! بتاؤ اب تم کیا کرو گے...... خاموش کیوں بیٹھے ہو؟“ وہ اس کو خاموش بیٹھا دیکھ کر آنکھوں میں خفگی لیے بولی۔

آں، ہاں کچھ نہیں، کرنا کیا ہے۔ چھوڑ دوں گا۔ میں اسے۔“ اس نے نارمل انداز میں کہا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ بارش کی چھوٹی بوندیں بھی ساتھ تھیں۔

”کیا؟ چھوڑ دو گے۔ تمہیں اپنی کزن میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ ذرا آگے کو ہو کے بے یقین لہجے میں بولی۔

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ میرے لیے بالکل غیر اہم ہے۔“ اس نے کانٹے سے پیزا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر وہ بالکل خاموش رہی، اسے اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ بھی تو یہی چاہتی تھی کہ زینب کی برہان کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ ہو اور برہان اس وقت غائب دماغی سے اسے سن اور جواب دے رہا تھا۔ اسے کہنا کچھ تھا اور کہہ کچھ اور رہا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا...... دماغ زینب میں الجھا ہوا تھا۔

اچانک وہ اٹھ کھڑا ہو میز پر رکھا والٹ اٹھایا اور کچھ نوٹ نکال کر فائل میں رکھے۔ اور والٹ اور موبائل جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”چلو رامین! رات ہونے کو ہے۔ ہمیں گھر جانا چاہیے، ممی پریشان ہوں گی۔“ رامین جو حیران پریشان اسے دیکھ رہی تھی۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چلنے لگی جو دروازے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ باہر قدم، رکھا تو تیز ہوا اور بارش کی موٹی بوندوں نے اس کا استقبال کیا۔ تقریباً دوڑتے ہوئے وہ دونوں گاڑی تک پہنچے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی پچھتاوے اور ملال نے اسے گھیر لیا۔ وہ شریف مرد کہہ رہا تھا خود کو اپنی بیوی کو اس نے گھر سے باہر جانے پر سینکڑوں لوگوں میں کھڑے ہو کر بے عزت کیا تھا اور وہ خود کیا تھا؟ خود بھی تو ایک لڑکی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ صرف اس لڑکی کی ناراضی دور کرنے کے لیے بس! جو اس کی کزن کے سوا کچھ نہیں لگتی تھی۔ پچھتاوا ہی پچھتاوا تھا۔

گیٹ کے اندر سرخ ٹائلوں کی بنی روش پر گاڑی دوڑاتے ہوئے چھت پر اسے ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً چھت پر کوئی تھا۔ اتنی تیز بارش اور ٹھنڈی ہوا میں وہاں کون کھڑا ہو سکتا تھا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اس نے رامین کو اندر جانے کو کہا اور خود وہ حویلی کے عقبی حصے میں آگیا جہاں گول چکر والی سیڑھیاں چھت پر جانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ قدم قدم زینے چڑھتے ہوئے وہ بس یہ سوچ رہا تھا کہ چھت پر آخر کون ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

سیڑھیوں سے باہر اوپر چھت پر قدم رکھتے ہی پانی کی موٹی بوندوں اور تیز ہوا کے تھپیڑوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیڑھیوں سے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا ابھی اس نے کہ ٹھٹھک کر رکا۔ اچانک بجلی چمکی اور پورا گاؤں ایک پل کے لیے روشن ہو گیا۔ صرف ایک پل کے لیے...... میرون ٹراؤزر اور قمیص پہنے لمبے بال کمر پہ پھیلائے وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ اسے ایک پل لگا تھا اسے پہچاننے میں۔ بلاشبہ وہ زینب تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ اس کے چہرے پر قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔

”زینب!“ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔ وہ ایسے ہی غصے سے اس کا بازو دبوچے تیز تیز قدموں سے زینے اترنے لگا۔ سیڑھیاں اترتے ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ اور غصے سے اس کی طرف

دیکھا جو بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے! ہوش میں تو ہو۔ اتنی تیز بارش میں تم چھت پر کیا کر رہی تھیں؟ بتاؤ! جواب دو مجھے۔“ وہ غصے سے اس پر چلا رہا تھا۔

برآمدہ حویلی کے عقب میں تھا۔ تمام کمروں کی ایک ایک کھڑکیاں برآمدے کی طرف کھلتی تھیں۔ لیکن زیادہ تر یہ کھڑکیاں بند ہی رہتی تھیں۔ برآمدے کی تمام بتیاں گل تھیں صرف چند ایک کے۔

”تم پاگل ہوئی؟ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ اس کے بازو ایسے ہی دبوچے وہ غصے سے پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا جاگنے والا پچھتاوا ختم ہو چکا تھا اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ وہ اس کی فکر کر رہا تھا کیوں؟ زینب بے یقینی سے بس اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاتھ چھوڑو میرا۔“ وہ نفرت میں ڈوبے لہجے میں بولی۔

”نہیں چھوڑ رہا میں تمہارا ہاتھ۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو!“ وہ بھی مصر تھا۔ گہرا اندھیرا۔ گہری رات، تیز بارش اور ضدی سے وہ دونوں۔ وہ مزاحمت کرنے لگی۔ ہاتھ بھی تو چھڑوانا تھا۔

”مسٹر برہان! آپ کو یاد ہو گا، آج ہی میں نے آپ سے کہا تھا۔ کہ میرے منہ مت لگیے گا۔ اور ویسے بھی......“ وہ اپنا بازو چھڑا کر پوری طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”اور ویسے بھی...... میں زینب داؤد! ایک آوارہ لڑکی ہوں اور تم شریف مرد! شریف مرد آوارہ عورت کا بازو نہیں پکڑا کرتے۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔“

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ تحمل سے بولی اور پلٹ گئی۔ پھر رکی۔

”آپ میری نہیں رامین کی فکر کرتے اچھے لگتے ہیں۔“ گردن موڑے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ قدم قدم وہ اندھیرے میں ڈوبتی گئی۔ بادل گرجے۔ وہ چیخی نہیں بلکہ تحمل سے چلتی گئی۔ بجلی بھی چمکی۔

برہان نے بجلی کی روشنی میں اسے دور جاتے دیکھا۔ چچی نے رامین کو صرف اس لیے بلایا تھا تاکہ وہ جو کروانا چاہیں، اس سے کروائیں اور خود کسی کی نظروں میں نہ آئیں۔ وہ چچی کی چال سمجھ گئی تھی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کاریڈور میں تیز تیز چلتی وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اور دوسری طرف...... برہان! وہ ویسے ہی ساکت اندھیرے میں ڈوبا کھڑا تھا۔ وہ صحیح تو کہہ کر گئی تھی کہ اسے اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے خود ہی تو اسے آوارہ کہا تھا۔ پھر کیوں اس نے اس کا بازو پکڑا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ پھر کیوں اس کی فکر ہوئی تھی اسے؟ کیوں؟

لاؤنج عبور کر کے وہ کوریڈور میں آگے بڑھنے لگا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ زینب کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں ایک ابال سا اٹھا۔ نفرت کا ابال۔

”ممی ٹھیک کہتی ہیں، یہ لڑکی نفرت کے لائق ہے بس!“ یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ زینب سے کروائی گئی اس بے عزتی کا بدلہ تو وہ ضرور لے گا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کا وجود تھکن سے چور تھا۔ چہرہ زرد اور کھلے بال الجھے ہوئے تھے۔ رات کو کپڑے تبدیل کر کے وہ ایسے ہی کمبل میں لپٹ گئی تھی۔ اور اب...... اس کا جسم ہلنے سے بھی انکاری تھا۔ اسے برہان سے شدید محبت تھی۔ برہان کا لہجہ! وہ چھت پر کھڑی بس یہی سوچ رہی تھی کہ اگر اس سے چھین لیا گیا تو وہ کیا کرے گی برہان کو کھو دینے کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ رامین کے ساتھ وہاں ڈیٹ پر آیا تھا اور اسے آوارہ ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اور ساری کسر چچی نے رامین کو اس گھر میں بلا کر پوری کر دی تھی۔ انہیں منع ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان کا بھی تو حق تھا اس گھر پر۔ اور وہ ویسے بھی خود مختار تھیں۔

ان ہی سوچوں میں غلطاں وہ بیڈ پر چھت کو گھورتی ساکت لیٹی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ...... ناکام۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک وہ خود نہ ہار مان لے۔ وہ آٹھ سال کی تھی جب اس کی ماں فاطمہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اٹھی آہستہ آہستہ قدموں کو گھسیٹتی دروازے تک پہنچی۔ دروازے کے اس پار سمیرا اور اریشہ دونوں کھڑی تھیں۔ دونوں کے چہروں سے فکرمندی و تشویش عیاں تھی۔

"کیا ہوا تمہیں زینی! طبیعت تو ٹھیک ہے۔" اریشہ نے آگے بڑھ کے اسے کندھوں سے تھاما۔

"اوہ اللہ! کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔" سمیرا اسے دیکھ رہی تھی۔

"سمیرا! تم اس کے لیے ناشتہ لے کر آؤ۔" اریشہ نے سمیرا کو باہر جانے کا کہا اور خود اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھایا۔ اور اس کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے تو شیشے کے اس پار سے روشنی جھلکنے لگی۔ پورا کمرہ ترتیب دے کر وہ اس کے پاس چلی آئی۔ زینب نے جھکا ہوا زرد چہرہ اٹھایا۔

"زینی!" اریشہ نے نرم لہجے میں اسے پکارا بات کرنے کا کوئی سرا ڈھونڈ رہی تھی وہ۔ شاید۔

"زینی! ایم سوری! سب میری وجہ سے ہوا تھا نہ میں باہر جانے کی ضد کرتی اور نہ یہ سب ہوتا۔ میں بہت شرمندہ ہوں، کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟" وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے نرم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

"اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ آئندہ ایسی کوئی بات مت کرنا۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ اریشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہیئر برش پکڑ کر اس کے بال سنوارنے لگی۔ اس کے سیاہ بال بہت خوب صورت تھے۔

"زینب! رامین آئی ہوئی ہے۔ وہ کوئی بہت زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے کسی انداز سے لگتا ہے کہ وہ برہان بھائی سے محبت کرتی ہے۔ یہ سب تو صرف ممانی کی چال ہے اسے یہاں بلوانے کی اور تمہیں تنگ کرنے کی بس! اور کچھ نہیں ہے۔" مکڑی کے جالے کی طرح الجھے ہوئے بال اب الگ الگ ہو کر کمر پر پھیل گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اسے سنتے ہوئے آئینے میں اپنا اور اس کا عکس دیکھ رہی تھی۔

"اور تم جانتی ہو، بہت سے لوگوں کا مقابلہ بہت سوچ کر کرنا ہوتا ہے۔ سمجھ داری سے۔ خاموشی سے۔ کسی کو کوئی بھی تکلیف دیے بغیر۔ تمہارے اور برہان بھائی کے درمیان رامین حائل ہے بالکل شیشے کی دیوار کی طرح، دھندلی، مبہم غیر واضح اس دیوار کو اپنے سامنے سے غائب کرنا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ اور......" وہ اب اسے کھڑکی کے پاس رکھے میرون مخملی صوفے پر بٹھا رہی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"اور کسی بھی دیوار کو زخمی ہوئے بغیر نہیں پاٹا جا سکتا۔ تمہیں بھی زخمی ہونا پڑے گا۔ مرنا پڑے گا۔ تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اور ہمیں یعنی انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود نہ ہار مان لے۔ سمجھ رہی ہو نا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس کے پوچھنے پر اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور تبھی سمیرا ہاتھ میں ٹرے اندر داخل ہوئی اور اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ ان کے کہنے پر وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ ناشتہ کرنے لگی۔ سلائس کا ٹکڑا چبانے سے بھی اس کے جبڑے دکھ رہے تھے۔ آنکھوں سے تپش نکلنے لگی۔ اچانک ہی سر کے پچھلے حصے میں درد شروع ہونے لگا۔ تھوڑی دیر گزری دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ تینوں دروازے کی سمت دیکھنے لگیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر ممانی کا چہرہ نمودار ہوا۔ ان کے چہرے پر غصہ واکتاہٹ واضح تھی۔ وہ کڑے تیوروں سے سمیرا کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ بے اختیار وہ تینوں ہی کھڑی ہو گئیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے سمیرا کی طرف د ہوئے کہا۔ آنکھوں میں چبھن واضح

تھی۔ طنزیہ نظریں زینب پر جمی تھیں۔

"ممی! وہ...... میں زینی کے لیے ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس کی...... طبیعت خراب ہے اس لیے......"

"اچھا! ہو گئے ابھی سے اس کے ناز نخرے شروع...... چار دن نہیں ہوئے ہمیں یہاں آئے اور ابھی سے ہی اس کی ناز برداریاں شروع ہو گئیں۔ آؤ، رامین بلا رہی ہے تمہیں! یہیں چپکی رہتی ہو ہر وقت۔" ہتک آمیز لہجے میں کہتے وہ ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالنا نہ بھولیں اور چوکھٹ پار کر گئیں۔ وہ اس کا سر جھک گیا تھا۔ تھوڑی سینے سے لگ چکی تھی۔ خزاں رسیدہ پتے کی مانند دونوں ماں بیٹے نے اسے پیروں تلے کچل دیا تھا۔ آنسو رخساروں پر بہہ کر دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ اریشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے سر اوپر نہیں اٹھایا۔ بس بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ سسکیوں کی آواز سانس کی آواز سے زیادہ نہ تھی۔ بے اختیار اریشہ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ...... بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

اس کا ہر آنسو اس کے دل پر ایک داغ لگا رہا تھا۔ دہکتا، سلگتا، جلتا ہوا داغ، وہ جل رہی تھی محبت میں۔ برہان کی محبت میں۔

☆☆☆

رامین کو حویلی آئے کئی دن ہو گئے تھے۔ زینب اور رامین کا آمنا سامنا ہوتا تو رسمی دعا سلام پر منحصر ہوتا۔ اس رات کے بعد سے زینب کا برہان سے بھی سامنا نہ ہوا تھا۔ آج بھی گھر کے قریباً تمام افراد ہی اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ سمیرا اور اریشہ پرانے کپڑوں سے کشنز بنانے میں مصروف تھیں۔ پھپھو کچن میں تھیں۔ زینب گملے میں لگے سرخ گلاب کے پودے کی صاف صفائی کر رہی تھی جو لاؤنج کے دروازے کے پاس رکھا تھا۔ برہان آج گھر میں ہی تھا، شاید وہ اپنے کمرے میں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے برہان کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور پھر زینے سے چڑھتے اور...... رامین کو زینے اترتے۔ تبھی سنوری رامین گہرے سبز رنگ کے ٹراؤزر اور ہلکے سبز رنگ کی قمیص پہنے دوپٹہ شانے پر ڈالے سج سج چل رہی تھی۔ جب دونوں ساتھ ہوئے تو اس نے ایک خوب صورت مسکراہٹ برہان کی طرف اچھالی۔ برہان سر جھٹکتا اوپر چڑھ گیا۔

گملے کے پاس بیٹھی زینب داؤد نے یہ منظر دکھتے دل کے ساتھ دیکھا۔

اریشہ اور سمیرا لاؤنج میں بچھے کارپٹ پر کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ رامین زینے سے اتر کر کھلے بالوں کو بائیں کندھے پر ڈالتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

تمام کانٹ چھانٹ کر کے وہ اٹھی اور لاؤنج کی قدم آدم کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تو شام کا سنہرا پن ہر سو اتر ہوا تھا۔

"پھپھو! بھوک لگی ہے، جلدی سے کچھ کھانے کے لیے لے آئیں پلیز!" سمیرا نے بلند آواز میں کہا۔ اتنے میں رامین کو کچن کے دروازے سے باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سلش سے بھرا گلاس تھا۔ پردے ایک طرف سرکا کر وہ بھی ان دونوں کے پاس آ بیٹھی۔ اچانک ہی کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو تینوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ غالباً رامین کے ہاتھ سے سلش سے بھرا گلاس چھوٹا تھا اور ماربل کے فرش پر ٹکرے ٹکرے ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کچن کی طرف بڑھی۔ اریشہ نے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے نظر انداز کر دیا کہ زبیدہ اٹھا لے گی۔ رامین اسے آتا دیکھتی رہی۔

"رامین! آپ ہٹیں یہاں سے میں یہ اٹھا لیتی ہوں۔" اس نے جھک کر کانچ کو اٹھانا چاہا۔

"ہاں! ویسے بھی ایسے چیپ کام تم جیسے دیہاتی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ میرے جیسی نفاست پسند لڑکی نہیں۔" اپنی خوب صورت آواز سے زہر اگلتی وہ ایک طرف ہو گئی۔ اچانک اس کے ہاتھوں میں کانچ کا ٹکڑا اندر تک دھنس گیا۔ اس کی ہلکی سی کراہ نکلی۔ سیڑھیاں اترتا برہان وہیں ٹھٹک کر رکا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹا

نہیں تھا چھوڑا گیا تھا۔ برہان جانتا تھا۔
"رامین! تمیز سے بات کرو۔ تمہیں زینب سے ایسے نہیں بات کرنی چاہیے۔"
سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز قدرے اونچی تھی اس لیے گھر میں موجود تمام افراد باہر لاؤنج میں آگئے تھے۔ تب خون کا سرخ قطرہ سفید فرش پر گرا۔
"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کس کو کتنی عزت دینی ہے۔ اور کون کس لائق ہے۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔ فار گاڈ سیک!" وہ انتہائی سفاکی سے اونچی آواز میں بولی۔ برہان کچھ آگے بڑھ آیا۔ خون کے قطرے ایک ایک کر کے بہہ رہے تھے۔
"وہ زینی! خون ......" اریشہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس چلی آئی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ زینب سکتے کی حالت میں وہیں بیٹھی تھی۔ خاموش...... بے یقین...... ٹوٹی بکھری بالکل کانچ کے ٹکڑوں کی طرح۔
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو!" ایک دم وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی برہان بھی کھڑا تھا خاموش۔
"بعض دفعہ ہم کسی کو اس کی اوقات سے بڑھ کر عزت دیتے ہیں اور پھر پتا ہے کہ کیا ہوتا ہے، اسی انسان کے ہاتھوں ہم بے عزت ہوتے ہیں بالکل جیسے تم مجھے کر رہی ہو۔ میں نے بھی تو تمہیں اوقات سے بڑھ کر عزت دی تھی۔" تحمل سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ سب کو نظر انداز کرتی کہہ رہی تھی۔
خون اب ہتھیلی سے بہتا ہاتھ کی بڑی انگلی سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ پھپھو خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ البتہ آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ برہان اب بھی خاموش تھا، اسے خاموش ہی رہنا چاہیے تھا جب رامین نے اسے بے عزت کیا تھا تب بھی وہ خاموش رہا اور اب بھی۔ سمجھ دار تھا۔ چچی بگڑے تیوروں سے اسے تک رہی تھیں۔
"بدتمیز لڑکی!" چچی اونچی آواز میں بولیں۔ رامین پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اریشہ فرسٹ ایڈ باکس لے آئی تھی۔ کانچ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے صوفے پر بٹھا کر کانچ نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عابدہ چچی وہاں سے جا چکی تھیں۔ سمیرا، اریشہ، برہان، پھپھو اور وہ سب وہاں موجود تھے۔ برہان دانتوں تلے نچلا لب بھینچے خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"لگتا ہے کانچ کا نوک دار ٹکڑا اندر تک دھنس گیا ہے۔" اریشہ نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے مدد طلب نظروں سے برہان کی طرف دیکھا، وہ آگے بڑھا فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھیں حیران تھیں۔
"بہت پھوہڑ لڑکی ہو تم! کانچ اٹھانا بھی نہیں آتا۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ سمیرا اور پھپھو دھیمے سے مسکرا دیں۔ وہ یک ٹک حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"دیکھو! تیار رہنا۔ میں تین تک گنوں گا اور تین کہتے کے ساتھ ہی اسے کھینچ نکالوں گا اور تم چیخنا مت ٹھیک؟" اس نے اچانک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس نے خفت سے سر جھکا دیا وہ اتنی اپنائیت سے کہہ رہا تھا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا اس کے لیے۔
تین کہتے کے ساتھ ہی اس نے کانچ کھینچ نکالا۔ اب وہ بینڈیج کر رہا تھا نرمی سے۔ بینڈیج کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب وہ اریشہ کو پین کلر نکال کر پکڑا رہا تھا اور ساتھ ہی دودھ کے ساتھ اسے دینے کی تاکید کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ سمیرا اور پھپھو اسے لیے اس کے کمرے میں چلی گئیں۔ اریشہ کچن میں آگئی اور برہان عابدہ بیگم کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، یقیناً ابھی کچھ دیر پہلے کی جانے والی گستاخی کی معذرت کرنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ سرخ چہرہ لیے بیڈ پر بیٹھی تھیں جب برہان نے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ برہان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"ممی!" بے بسی بھرے لہجے میں اس نے پکارا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔
"آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں؟" لہجے میں اب بھی بے بسی تھی۔ انہوں نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔
"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیوں خفا ہوں۔" وہ غرائیں۔
"برہان! تم نے رامین میں اپنی دلچسپی کے بارے میں بتایا تھا پھر کیوں کیا تھا تم نے اس جاہل لڑکی سے نکاح۔ مجھے تم سے امید تھی کہ تم رامین کو نظر انداز نہیں کرو گے لیکن تم نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، اب تم بھی سمیرا کی طرح اس کی ناز برداریاں کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہو۔ مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں کیا جواب دوں گی میں زاہدہ آپا کو جنہیں اب تک تمہارے نکاح سے بے خبر رکھا ہوا ہے میں نے۔ جب ان کو پتا چلے گا تو کیا ری ایکشن ہوگا ان کا؟" وہ تو پھٹ ہی پڑی تھیں۔ برہان نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
"ایم سوری! ممی۔" وہ شرمندگی میں ڈوبا بس اتنا ہی کہہ پایا تھا۔
"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اس قدر ناخوش ہیں ہمارے اس نکاح سے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے جلد ہی اپنی زندگی سے نکال دوں۔" وہ آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا اور دروازے کے دوسری طرف کھڑی سمیرا نے ہر لفظ بغور سنا تھا۔
"ممی آخر کیوں چاہتی ہیں کہ کسی لڑکی کا گھر تباہ ہو۔" جو وہ سوچ رہی تھی کہ برہان کے دل میں زینب کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں، اب سب کچھ اسے جیسے برباد ہوتا نظر آ رہا تھا۔ غصے کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

☆☆☆

گھڑی رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔ سر شام ہی پین کلر لے کر وہ ایسا سوئی کہ اب اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں نیم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی تو یک دم تیز روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی بے اختیار اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ کھلے بالوں کو ڈھیلی چوٹی میں باندھا تو ہاتھ کو حرکت دینے سے اسے میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آہستہ آہستہ قدموں کو گھسیٹتی وہ باتھ روم میں چلی آئی۔
اس نے نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ پورے بارہ بجے فارغ ہوئی تھی اب اسے بھوک محسوس ہونے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھول کر وہ آہستگی سے باہر نکلی اور اپنے اطراف میں دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے قریباً سب افراد سو گئے تھے لیکن نہیں...... برہان کے کمرے سے روشنی چھلک رہی تھی۔ غالباً وہ جاگ رہا تھا۔
وہ کچن میں چلی آئی۔ فریج کا دروازہ کھولا اور اندر دیکھنے لگی۔ رات کا بچا ہوا کھانا ترتیب سے رکھا ہوا تھا لیکن وہ اس وقت کچھ گرم کر کے کھانے کی متحمل نہیں تھی۔ سو کیبنٹ سے نوڈلز کا پیکٹ نکالا اور چولہا جلا کر اس پر پانی رکھا۔ درد اب بڑھنے لگا تھا۔ وہ رک کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ انگوٹھے کے پاس سے موٹی نرم ہتھیلی میں کانچ کا ٹکڑا چبا تھا۔
برہان نے انگوٹھے کے گرد گھما گھما کر پٹی کی تھی ڈی ایس پی آف پولیس ہونے کے باوجود اس نے بہت اچھے طریقے سے پٹی کی تھی۔ تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ برہان ہاتھ میں فائل لیے کچھ الجھا الجھا سا کھڑا تھا وہ آگے بڑھا اور کاؤنٹر کے پاس اس سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ وہ اب پیکٹ کھولنے لگی تھی دل البتہ دھک دھک کر رہا تھا۔
"کیا کر رہی ہو؟" عجیب انداز میں اس نے استفسار کیا۔
"یقیناً آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں اپنے لیے نوڈلز بنا رہی ہوں۔" وہ زینب تھی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ وہ خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی سرا ڈھونڈ رہا ہو۔

''تم ......!'' کچھ سوچ کر وہ بولا۔ ''تم! ایک اچھی میزبان نہیں ہو۔ زینب داؤد!'' وہ جیسے اسے جتا رہا تھا۔ نوڈلز کا پیکٹ پانی میں انڈیلتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ اچنبھے سے اسے تکنے لگی۔

''آئی مین! تمہیں رامین ...... کی انسلٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تمہاری مہمان ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا وہ گڑبڑا گئی۔ اور دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

''تم میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہو گی؟'' وہ جیسے اس کی خاموشی سے اکتا گیا تھا تبھی بے زاری سے گویا ہوا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو، کون صحیح تھا اور کون غلط۔ پھر بھی تم رامین کی حمایت کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں اب کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ شانے اچکا کر بولی۔ دل البتہ کچھ مضطرب تھا۔

''رامین صحیح تھی اور تم ......'' اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ گردن موڑ کے بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ دن پہلے برہان کے لیے زینب ناقابل برداشت تھی اور اب وہ رات کے گہرے اندھیرے میں اس سے بالکل نارمل انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں نے اب تمہارے راستے میں آنا چھوڑ دیا ہے۔ اکیلی گھر سے باہر بھی نہیں جاتی پھر؟ پھر تم اب کیا چاہتے ہو؟'' وہ دبے لہجے میں غصے سے کہہ رہی تھی۔ چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا اور اپنا لے کر ایک طرف ہو گئی۔

وہ اس دن بھی اکیلی نہیں تھی۔ حماد، سمیرا اور اریشہ اس کے ساتھ تھے پھر بھی وہ اس شخص کو وضاحت دے رہی تھی۔ جس نے اسے سینکڑوں لوگوں کے درمیان بے عزت کیا تھا۔

''تم مجھے آزاد کر دو بس اور کچھ نہیں۔ رشتہ ختم، قصہ ختم۔'' وہ سن کھڑی اسے سن رہی تھی۔

''یو نو عموماً لڑکیاں یہ سوال کرتی ہی اپنے شوہروں سے ہیں لیکن میں تمہارا شوہر ہو کر تم سے یہ ریکویسٹ کر رہا ہوں۔'' چائے کا گھونٹ اس کے حلق کو کڑوا کر گیا تھا اس نے کاؤنٹر پہ کپ رکھ دیا۔ گلا خشک ہونے کو تھا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' اس نے تحمل سے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔ ہاتھ کا درد دگنا ہو گیا تھا۔ نوڈلز کا باؤل کاؤنٹر پر چائے کے کپ کے ساتھ رکھا تھا۔

''دیکھو! اگر میں ایسا کروں گا تو ......'' کچھ دیر وہ خاموشی سے لب کاٹنے لگا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حلق میں کچھ اٹکنے لگا تھا۔

''آئی نو! کہ تم ایسا کیوں نہیں کرنا چاہتیں کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ ایک نہ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا وہی تھرڈ کلاس سوچ۔ لیکن یاد رکھنا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا تم کچھ بھی کر لو لیکن پھر بھی تم میرے لیے غیر اہم رہو گی۔''

وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ سفاکی سے کہہ رہا تھا زینب کا وجود سرد پڑتا جا رہا تھا، اتنا سرد کہ جیسے کسی نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل انڈیل دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چائے کا کپ شیلف پہ قریباً پٹخا تھا اور فائل اٹھائے تیز تیز قدموں سے کچن سے نکل گیا۔ وہ وہیں کھڑی بس اسے جاتا دیکھتی رہی۔ آنسو جو اتنی دیر سے ضبط کر رہی تھی بے اختیار ٹپ ٹپ برسنے لگے۔

اپنے کمرے میں آ کر کھڑکی کے پاس رکھے میرون صوفے پہ پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دیے بے آواز رونے لگی۔ اس کا دل بار بار بھر رہا تھا۔ ذہن میں، آنکھوں کے پیچھے ہر جگہ کچن کا منظر امڈ رہا تھا وہ دبے دبے غصے سے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے غیر اہم ہے بالکل غیر اہم۔ نیند اس پر طاری ہوئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

''زینب!'' وہ خواب کے زیر اثر تھی جب اس کے کانوں سے جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔

''زینب! میں حمزہ ہوں۔ اٹھو اور بات سنو میری!'' وہ ہولے سے اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ اسے

سننا چاہیے تھا، وہ اس کا بھائی تھا وہ یکدم اٹھ بیٹھی بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی بہت سے آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

''کیا ہوا؟ زینی! تم رو کیوں رہی ہو؟'' اسے روتا دیکھ وہ پریشانی سے آگے بڑھا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ آہستہ آہستہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے واقعی اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔

''ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے بات بناتے ہوئے کہا سچ بھی تھا درد بھی ہو رہا تھا۔

''اوہ لڑکی! تم نے بینڈیج تبدیل نہیں کی۔'' اس نے ہاتھ کو دیکھا تو بے اختیار اپنے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔

''بس اتنی سی بات تھی! جس کے لیے تم اپنے قیمتی آنسو بہا رہی تھیں۔'' اس نے پٹی کرتے ہوئے کہا۔

''میرے آنسو صرف تمہارے لیے قیمتی ہیں حمزہ! کسی اور کے لیے نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''کوئی بھی لڑکی کم از کم اتنے سے زخم کے لیے تو ایسے نہیں روئے گی۔ اب سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے پھر مجھے جانا بھی ہے۔'' وہ تو جیسے سچ ہی سننا چاہتا تھا۔

''حمزہ! ہر مرد کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ جو لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی محبت میں ہر حد پار کر جائے گی، اس کے بغیر جی نہیں سکے گی مر جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ٹھکرائے جانے کے بعد لڑکی اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے، وہ جینا سیکھ جاتی ہے۔ اس کا جذباتی پن ختم ہو کر سنجیدگی میں بدل جاتا ہے۔ برہان بھی یہی سمجھتا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی اور حمزہ کی طرف دیکھا جو سانس روکے اسے سن رہا تھا۔

''برہان نے مجھ سے اس رشتے کو ختم کرنے کی بات کی تھی وہ چاہتا ہے کہ میں یہ قصہ ختم کر دوں۔ وہ رامین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے کل ہونے والی ساری گفتگو سنائی۔ وہ جواباً پوری توجہ و یکسوئی سے سن رہا تھا بے اختیار گہری سانس خارج کی۔

''تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اٹھائے۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ بابا سے بات کر کے اس سے خلع لے لوں۔ اس کی مشکل آسان کر دوں۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ حمزہ بے اختیار مسکرا دیا۔

''ابھی تم نے کہا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتا، تم سے نفرت کرتا ہے، ہے نا۔ پھر بھی تم ایسے شخص کی مشکل آسان کرنا چاہتی ہو؟ پاگل لڑکی!'' اس نے دو انگلیوں سے اس کی کنپٹی کو چھوا۔

''وہ کچھ پریشان ہے کیونکہ کچھ لوگ آئی مین کرمنلز اسے بلیک میل کر رہے ہیں، اسی لیے وہ کچھ الجھا الجھا رہتا ہے۔ میری بات ہوئی تھی اس سے۔ اسے کچھ وقت دو، ہو سکتا ہے سب ٹھیک ہو جائے۔'' اس کی نرم آواز میں محبت کی مٹھاس تھی۔ اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اگر کچھ ٹھیک نہ ہوا تو ......؟'' بعض دفعہ اگر کتنے خطرناک ہوتے ہیں اس نے آج محسوس کیا تھا اس بات کو۔

''پھر میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ جو تمہیں اچھا لگے گا، تم وہ کر لینا ٹھیک؟'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

وہ خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

وقت بہت ہی تیزی سے گزر رہا تھا۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے رامین ایک بار اپنے گھر جا کر واپس آ گئی تھی۔ برہان کا رویہ بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ جتنا ٹائم گزارتا رامین کی ہمراہی میں نظر آتا کبھی لان میں، کبھی لاؤنج میں، کبھی اسٹڈی میں۔ ایک دن رامین اور وہ کچھ دیر پہلے ہی لان سے واپس آئے تھے برہان تو اپنے

کمرے میں چلا گیا اور وہ لاؤنج میں رکھے کریم کلر مخملی صوفوں کی طرف آ گئی جہاں سمیرا بیٹھی تھی۔

اس نے گہرے نیلے رنگ کی اسکرٹ اور سرمئی رنگ کا آدھی آستینوں کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بال کھلے اور ہلکا میک کیے وہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی جو کچھ الجھی الجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر وہ آپس میں خوش گپیاں کرتی رہیں پھر سمیرا اصل بات پہ آ گئی۔

"رامین! وہ دراصل مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ دیکھو تم ناراض مت ہونا پلیز!" وہ قدرے لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں بولو! کیا کہنا ہے؟" وہ نخوت سے بولی۔ ازلی انداز گفتگو۔

"تم برہان کے ساتھ زیادہ مت رہا کرو۔ وہ اب شادی شدہ ہے، ایسے اچھا نہیں لگتا۔" وہ شادی شدہ پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

"کسے اچھا نہیں لگتا زینب کو؟" اسے یہ بات ناگوار گزری تھی۔ "میں جانتی ہوں، یقیناً تم سے زینب نے ہی کہا ہوگا۔" اس نے پھر کہا۔ لہجے میں الجھن اور ناگواری واضح تھی۔

"نہیں، اس نے نہیں کہا، میں خود کہہ رہی ہوں مجھے لگتا ہے، یہ اچھی بات نہیں ہے کیونکہ وہ اب شادی شدہ ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔" وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں کہ تم بہت تنگ دل ہو۔ زینب بھی ہے۔ تمہیں برہان کا مجھے کمپنی دینا اچھا نہیں لگتا زینب کو اچھا نہیں لگتا، تمہیں پہلے بھی برہان کا میرے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس فرق اتنا تھا پہلے تم کہتی نہیں تھیں اور اب کہہ دیتی ہو۔" وہ چلاتے ہوئے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر بولی۔ سمیرا ہونق بنی اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ لاؤنج گھر کے افراد سے بھرنے لگا تھا، سب ہی حق دق تھے۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" پھپھو نے مداخلت کی۔

"ہونا کیا ہے؟ ضرور اس زینب کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہو گیا ہوگا۔" عابدہ بیگم نے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا جو یہ بات سن کے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ روہانسی ہو گئی۔ برہان بازو سینے پہ لپیٹے خاموش کھڑا تھا۔

"ممی! زینب نے کچھ نہیں کیا۔ آپ پلیز ہر بات میں اسے مت گھسیٹا کریں۔" سمیرا نے کہا۔

"دیکھا تم نے برہان! اس ایک لڑکی کی وجہ سے۔ صرف اس کی وجہ سے پہلے میرا شوہر بدگمان ہوا مجھ سے اور اب...... اب میری بیٹی زبان درازی کر رہی ہے۔" چچی اب باقاعدہ رونے لگی تھیں۔ برہان نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور رکھائی چھائی تھی۔ قدم قدم چلتا وہ اس کے سامنے رکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"کیا چاہتی ہو آخر تم؟" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ اسے سب یاد آ رہا تھا۔ برہان سے ہونے والی اس کی بے عزتی، اکیلے میں، سب کے سامنے، پیزا ہٹ...... سینکڑوں لوگ۔

"معافی مانگو! رامین سے ابھی اور اسی وقت۔" اس نے سرد لہجے میں کہا، البتہ پیشانی پہ شکنیں تھیں۔

"اس نے کچھ نہیں کیا۔" سمیرا ضبط کھو کر چلائی۔ کچھ دیر پہلے چچی کے چہرے پہ آنے والا اطمینان اب غصے میں بدل گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سمیرا کے منہ پہ تھپڑ دے مارا۔ سب کے منہ کھل گئے رامین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ خاموش رہو اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ اپنی بکواس بند رکھو۔" انگلی اٹھا کر وہ اسے متنبہ کرتے ہوئے بولیں۔ سمیرا کے آنسو بہہ نکلے اور وہ...... وہیں اپنی جگہ پہ سن کھڑی رہ گئی۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بھابھی!" پھپھو تاسف سے بولیں۔

"جو مجھے بہتر لگا وہ میں نے کیا ہے۔" قطعیت سے کہا گیا۔ انداز ایسا کہ جیسے پھپھو سے کہہ رہی ہوں کہ تم خاموش رہو۔ پھپھو نے لب بھینچ لیے۔

"ممی! ہمیشہ وہ کرتی ہیں جو صحیح ہوتا ہے۔ انہوں نے کبھی کچھ غلط نہیں کیا اور...... یہ کچھ غلط کر ہی نہیں سکتیں۔ کسی کی بیٹی کو اس کے شوہر کی نظروں میں گرانا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ آپ نے بار بار زینب کو ٹھکرایا ہے۔ وہ کیا جو آپ کو بہتر لگا ہمیشہ...... لیکن دیکھیے گا ممی ٹھیک ایسے ہی جیسے آپ نے ٹھکرایا کوئی آپ کی بیٹی کو بھی ٹھکرائے گا۔ تب آپ کو پتا چلے گا کہ آپ نے کیا کیا؟ غلط یا صحیح؟"

پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ چچی ایسے ہی کھڑی تھیں چہرے پہ کوئی بھی تاثر لیے بغیر اور وہ بت بنی وہیں کھڑی تھی۔

سب وہاں سے چلے گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حمزہ، حماد، داؤد صاحب اور حسین صاحب تو تھے ہی نہیں۔ زینب کے پاس بس عائشہ کھڑی تھیں۔ انہوں نے اس کے کندھے پہ اپنا نرم ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر گردن موڑ کر انہیں دیکھا جن کے چہرے پہ صدیوں کی تکان تھی۔ بے اختیار وہ ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج پھر اسے ماں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

سرخ حویلی پہ شام اتر رہی تھی۔ زینب کچن میں کھڑی شام کی چائے زبیدہ خاتون کے ساتھ بنوا رہی تھی۔ پورے کچن میں الائچی اور تلے ہوئے کبابوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ چائے دم پہ رکھ کر وہ زبیدہ خاتون کی طرف مڑی اور ٹرالی میں لوازمات رکھوانے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے اٹھائے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج میں قریباً سب ہی موجود تھے سوائے داؤد، حسین اور حمزہ کے جو کسی دوست کے ہاں چائے پہ مدعو تھے۔ سب وہاں بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے سوائے برہان کے، وہ خاموش کچھ الجھا ہوا تھا۔ ماتھے پہ واضح متفکر شکنیں تھیں۔ رامین اسی شام واپس چلی گئی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو چائے کے کپ پکڑانے لگی۔ برہان کو کپ پکڑا کر وہ اپنے لیے چائے نکالنے لگی۔

"یہ چائے کس نے بنائی ہے؟" برہان نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔ لہجہ خاصا چبھتا ہوا تھا۔

"میں نے بنائی ہے۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"یہ...... یہ چائے بنائی ہے تم نے؟ آج کے بعد اتنی بکواس چائے مت دینا مجھے!" اس نے اونچی آواز میں کہا اور چائے کا کپ میز پہ پٹختے ہوئے وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ آنکھوں میں آئی نمی کو اس نے پلکیں جھپک جھپک کر واپس دھکیلا۔ اتنی توہین اور ذلت۔

☆☆☆

"پاپا!" سمیرا حسین صاحب کے کمرے میں چلی آئی۔ دوپہر پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی آج وہ گھر پہ ہی تھے۔

"جی!" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہیں کمرے میں عابدہ بیگم بھی تھیں، سمیرا انہیں یکسر نظر انداز کیے حسین صاحب کی طرف متوجہ تھی۔ اس دن کے بعد عابدہ بیگم اور سمیرا کے درمیان کچھ کچھ سرد مہری تھی۔

"پاپا! مجھے آپ سے ایک کام تھا۔" وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ عابدہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جی بولیں، کیا کام ہے۔ میں فارغ ہی ہوں۔" انہوں نے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کو پرے کھسکایا۔ اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"پاپا! وہ میری دوست سارہ کے پاپا ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ میں عیادت کے لیے جانا چاہتی تھی۔" اس نے کام بتایا۔ پیزا ہٹ میں ہونے والی عزت افزائی کے بعد سے وہ تینوں از حد محتاط ہو گئی

گئیں۔

''اوکے! چلی جانا کس کے ساتھ جاؤ گی ویسے؟'' یاد آنے پر انہوں نے پوچھا۔

''میں زینب کے ساتھ جاؤں گی۔ وہ اچھی ڈرائیونگ کرتی ہے۔'' کہتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا موبائل اٹھایا اور جلدی جلدی اپنے منگیتر کا نمبر ملانے لگی۔ یہی وہ شخص تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔

''ارسل! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' سلام کے بعد اس نے بنا تمہید باندھے جلدی جلدی کہا۔ آواز میں تھوڑی سی گھبراہٹ تھی۔

''کیا مطلب؟ ملنا چاہتی ہو کیوں؟'' اچانک ملنے کی فرمائش وہ تھوڑا حیران ہوا تھا۔

''ہاں! ملنا چاہتی ہوں، مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ کیا تم آج مل سکتے ہو؟'' وہ جھلاسی گئی تھی۔ دوسری طرف ارسل کی حیرانگی مزید بڑھ گئی۔

''کیسا کام یار!''

''ارسل! تم آج فارغ ہو یا نہیں۔'' سمیرا کو غصہ آ گیا تھا۔

''سمیرا! آج آفس میں اہم میٹنگ ہے۔ ہم کل دوپہر، لنچ ٹائم میں ملیں گے اوکے!'' اس نے بتایا۔ سمیرا نے بے اختیار سر جھٹکا۔

''ارسل! ہم کسی ریسٹورینٹ میں نہیں مل سکتے۔ میں کل ہسپتال آ رہی ہوں وہاں ملیں گے۔ ٹھیک؟'' کہہ کر اس نے کال بند کر دی۔

☆☆☆

''حمزہ! مجھے برہان سے خلع چاہیے۔ میں مزید اپنے لیے ناگواری برداشت نہیں کر سکتی۔ تم پلیز جلدی نوٹس تیار کروا دینا۔'' زینب ٹیرس پہ کھڑی تھی اس کی آواز میں واضح نمی تھی۔

''وکیل ہونے کا اب یہ نقصان بھی مجھے اٹھانا پڑے گا کہ بہن کے طلاق کے نوٹس میں تیار کرواؤں۔'' اسے جیسے دکھ نے آن گھیرا تھا۔ زینب نے رخ موڑ لیا اور ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''حمزہ! برہان میری زندگی میں صرف اتنے ہی وقت کے لیے آیا تھا۔ آج نہیں تو کل اسے مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتا، اسے رامین پسند ہے رامین کے چلے جانے کے بعد میں نے خود اس کی بڑھتی ہوئی ناگواری نوٹ کی ہے۔ اب میں مزید اسے مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔ میں جانتی ہوں اگر اس نے خود مجھے طلاق دی تو اسے چچا کی ناراضی برداشت کرنی پڑے گی اور یقیناً بابا کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔ میں نے بابا سے بات کر لی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایک دو دن میں میرا کام کر دینا۔''

اس نے رخ موڑا ہوا تھا لیکن آواز کی نمی سے صاف ظاہر تھا کہ آنسو بمشکل روکے ہوئے ہیں۔ بات مکمل کر کے وہ وہاں سے جانے کے لیے مڑی۔ حمزہ ویسے ہی کھڑا تھا بے حس و حرکت، حیران، پریشان۔

''زینب! تمہیں یاد ہے ممی کیا کہتی تھیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود نہ ہار مان لے۔ تم برہان کی بے زاری سے ہار مان رہی ہو؟'' پتھر بنے حمزہ کے وجود میں حرکت ہوئی۔ افسوس میں ڈوبا لب و لہجہ۔ وہ جاتے جاتے رکی، پلٹ کر دیکھا۔ کہا کچھ نہیں چند پل خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ دو آنسو خاموشی سے رخساروں پہ ڈھلک گئے۔ وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

''مجھے افسوس ہے کہ تم نے ہار مان لی ہے۔'' حمزہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ اس کے قدم ٹھہر گئے۔ ہلکی ہوا کا جھونکا آیا اور ریلنگ کے ساتھ رکھے گملوں میں لگے پھول لہلہا اٹھے۔ جانے کیوں؟ وہ مڑی آہستہ آہستہ چلتی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی جواب بھی اس کے مطالبے پہ بے یقین تھا۔

''حمزہ! جس رشتے کو جوڑنے کے لیے ہمیشہ آپ کو جھکنا پڑے تو اس رشتے کو جوڑنے سے بہتر

ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے۔'' تحمل سے ...کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا اپنا دل ...بھی راضی نہیں تھا لیکن یہ انا، خودداری، عزت نفس ...درمیان میں حاوی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شام کا گلابی آنچل ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ لان میں ...رکھی کرسی پر حسین صاحب بے حد پریشان بیٹھے تھے۔ ...ان کے دائیں جانب عابدہ بیگم کا اطمینان چھپائے نہ ...چھپ رہا تھا۔ زینب کی خلع والی بات پوری حویلی میں ...پھیل گئی تھی۔ برہان کو جب یہ بات پتا چلی اس نے ...کوئی ری ایکشن نہیں دیا بس خاموشی سے اپنے ...کمرے میں چلا گیا۔ سمیرا کا مارے غم و غصہ کے برا ...حال تھا وہ زینب کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ اس کی ...ایک خاموشی تھی سب کے جواب میں۔

''زینب! حسین ماموں تمہیں لان میں بلا رہے ...ہیں۔'' اریشہ نے اطلاع دی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ...دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پر پھیلایا۔ منہ پر پانی کے ...چھینٹے مارے۔ اریشہ چوکھٹ پر کھڑی بس اسے دیکھتی ...رہی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک خاموش ...نظر اس پر ڈالی۔

''ہار ہوتی ہے۔ لیکن ہار ایسی بھی ہوتی ہے میں ...نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے۔'' ...اس نے گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے جیسے ...افسوس سے کہا تھا۔ افسوس میں ڈوبی آواز بے یقین ...لب و لہجہ۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ ...گئی۔ لان میں چچا ادھر ادھر ٹہل رہے تھے اسے آتا ...دیکھ کر رک گئے۔ مسکراہٹ آج غائب تھی۔ پریشان، ...متفکر، الجھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''آؤ بیٹا! بات کرنی تھی آپ سے، آؤ، آؤ ...بیٹھو!'' انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا جس کے ...ساتھ ہی عابدہ چچی بیٹھی تھیں۔ وہ خاموشی سے ...سر جھکا کر وہاں بیٹھ گئی۔

''زینب! تم نے خلع کا مطالبہ کسی دباؤ کے تحت ...تو نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تم خود بھی کچھ پریشان ہو۔'' ان کی بات پر چچی کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں چچا جان! میں سب...... کچھ اپنی ...... مرضی سے کر رہی ہوں۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ ہمارا رشتہ بہت مضبوط نہیں ہے۔ جیسا کہ اسے ہونا چاہیے اور میں خود بھی برہان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔'' اس نے لاپروائی کی بھرپور اداکاری کے ساتھ شانے اچکا دیے۔ البتہ حلق میں کچھ اٹکنے لگا تھا۔ آنسو، ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں، اس کی بات پر عابدہ بیگم کا دل گویا اطمینان سے بھر گیا۔

''تم جاؤ زینب!'' انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

''کچھ لوگوں کو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔'' ان کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں تک بخوبی پہنچی تھی۔ اس کے مطالبے پر بابا نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ لاؤنج کا اندرونی دروازہ عبور کر کے اندر داخل ہوئی تب اس نے پھپھو کی آواز سنی۔ وہ شاید اسے بلا رہی تھیں۔ وہ قدم قدم زینے پر چڑھتی ان کے پورشن میں چلی آئی۔

''زینب! بیٹھو بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس۔ کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا۔ کچھ تو رحم کھاؤ خود پر۔ کیوں کر رہی ہو ایسے بے کار کے مطالبے؟'' زرد پڑتی رنگت، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے دیکھ کر وہ واقعی پریشان ہو گئی تھیں۔ لان سے وہ بمشکل اٹھ کر آئی تھی۔ آنسو جو اتنی دیر سے قابو کر رکھے تھے۔ بے اختیار بہہ نکلے۔ پھپھو کے کندھے پر سر رکھے، وہ روتی رہی، کتنا وقت گزرا اسے کچھ علم نہ تھا۔

''کیوں کیا ہے، تم نے خلع کا مطالبہ؟'' پھپھو آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

''پھپھو! برہان مجھے پسند نہیں کرتا۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ میں اسے مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہو سکتا ہے، تم نے اب اسے مشکل میں ڈال

دیا ہو۔" کبھی کبھار پھپھو کتنی مبہم باتیں کر جاتی ہیں ناں، اس نے اس وقت محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

"اف، یہ کٹنگ بورڈ کہاں گیا آخر۔" وہ کوفت سے بولی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہی تو چکی تھی وہ......

زبیدہ خاتون حیران و پریشان سی کھڑی تھیں۔ کٹنگ بورڈ آخر گیا تو کہاں گیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ میں اسٹور روم سے دوسرا والا لے آتی ہوں۔ تم تب تک مٹر چھیل لو۔" اسے پریشان کھڑا دیکھ کر زینب تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

عقبی برآمدے کے ساتھ ہی کچھ کمرے بنائے ہوئے تھے جنہیں عموماً اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ کمرے اس طرح بنائے گئے تھے کہ عقبی برآمدہ ان کمروں کے سامنے تھا۔ وہ اسٹور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ بٹن دبنے کی آواز سے پورا کمرہ پل بھر میں روشن ہو گیا تھا۔ کٹنگ بورڈ سامنے ہی رکھا تھا۔ اسے لے کر وہ باہر نکلی۔ دروازہ بند کر کے وہ جیسے ہی پلٹی پیچھے کھڑے برہان سے ٹکرائی۔ وہ پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور دروازے سے جا لگی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ آج پھر اسے اپنا اعتماد دھواں ہوتا نظر آیا تھا لیکن نہیں......

"کیا کر رہی ہو یہاں؟" وہ جیسے اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"میں یہاں یہ لینے آئی تھی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا کٹنگ بورڈ سامنے کیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ پھر رکی۔ گردن موڑ کر آنکھوں میں حیرت سموئے وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی کلائی برہان کے مضبوط ہاتھ میں تھی۔

"مجھ سے آزادی چاہتی ہو؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ زینب کا دل دکھ سے بھر گیا۔ پتا نہیں کیوں وہ سنجیدہ تھا۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ تم رامین سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" وہ جلدی بھولنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے لب بھینچ لیے۔

"اتنی فرماں برداری؟ اور وہ بھی میری۔ یہ بات ماننے کے لیے تم نے کچھ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر دیا۔ تم تھوڑا انتظار کر لیتیں۔" وہ عام سے لہجے میں بول رہا تھا لیکن زینب کو وہ طنز لگا تھا، وہ اندر تک کھول گئی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا۔" اس نے ضبط سے کہا۔

"برہان! آئی تھنک تمہیں یاد ہو گا، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں ایسا کوئی حق نہیں دیا۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔" شدت ضبط سے آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ خود کو بہادر ظاہر کرنا قدرے مشکل تھا۔ دل بار بار ڈر رہا تھا، آنکھیں بھیگنے کو بے تاب......

"لیکن میرے پاس ابھی ایسا ہر حق موجود ہے۔" وہ نارمل لہجے میں بہت کچھ جتا رہا تھا۔ اچانک ہی آسمان پر بہت سے سیاہ بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

"برہان پلیز!" وہ منت کرتے ہوئے بولی۔

وہ ویسے ہی کھڑا رہا۔

"برہان! ہاتھ چھوڑ دو میرا۔ تمہیں میرا ہاتھ پکڑنے کا کوئی حق نہیں۔" وہ تقریباً چلانے لگی تھی۔

اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ جانے کے لیے قدم بڑھانے ہی لگی تھی کہ برہان نے اپنا بازو آگے کر کے اسے ایک بار پھر روکا۔

"تم میری عزت کیوں نہیں کرتی ہو؟" اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ پریشان پریشان، الجھی ہوئی ویران آنکھیں۔

"تمہیں پتا ہے...... نہیں...... تمہیں نہیں پتا ہو گا۔ جب کوئی شخص کسی عورت کو اذیت دیتا ہے، سینکڑوں لوگوں کے درمیان اس کی بے عزتی کر دیتا ہے تو وہ عورت اس کی عزت کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ سو اسی لیے میں نے بھی تمہاری عزت کرنا چھوڑ دی

ہے۔" اس نے شانے اچکا دیے، برہان کو اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ آہستہ سے اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

بارش کی بوندیں برسنے لگی تھیں۔ چلتے چلتے وہ رکی اور پلٹ کر اسے دیکھا وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نچلا لب دانتوں تلے دبائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تمہاری عزت کرنا اب چھوڑی ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔" بارش کی بوندیں موٹی ہونے لگی تھیں۔

آنسو جو اتنی دیر سے رکے ہوئے تھے۔ بے اختیار بہہ نکلے۔ آنکھوں کے سامنے بار بار برہان کا ستا ہوا چہرہ آ رہا تھا۔ اس نے جو کہا تھا، سچ کہا تھا پہلے وہ واقعی برہان کی بہت عزت اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

☆☆☆

"بابا! ایم...... سو...... سوری بابا...... پلیز۔" داؤد صاحب کا کمزور ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ داؤد صاحب خاموشی سے اسے دیکھے گئے۔

"بابا! مجھے لگتا تھا کہ میں بہت بہادر لڑکی ہوں۔ اچھی بیٹی ہوں لیکن بابا! میں بہت بری ہوں۔ بہت نافرمان ہوں۔ آپ کی کوئی بات نہیں مانتی۔ پلیز بابا...... ایم سوری...... ایم رئیلی سوری۔" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ بار بار ان کے ہاتھ کو چوم رہی تھی۔ سسکیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

"نہیں نہیں...... بالکل نہیں میری بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ روؤ نہیں۔" انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور بے آواز بوسہ لیا۔ اس کے رونے میں اور شدت آ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے بال سہلانے لگے۔

"زینب!" انہوں نے مدھم آواز میں پکارا۔

"بیٹا! بعض دفعہ ہم بڑے بہت خود غرضی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں، جیسے میں نے کیا تھا۔ لیکن میں نے غلط کر دیا تھا۔ تم نے بھی مجھے خوش کرنے کے لیے ہاں کی تھی، ہے نا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ایسا لگتا تھا کہ میں نے غلط کر دیا ہے۔ تم اب روؤ نہیں میرے بچے! مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جا رہا۔" انہوں نے اس کا چہرہ سامنے کیا۔ اس کی آنکھیں سرخ، سوج گئی تھیں، وہ بہت عرصے بعد اتنا کھل کے روئی تھی۔

"بابا! آپ...... مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا۔" رو رو کر آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"نہیں میری جان! بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر ماتھے پر بوسہ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

"تم جاؤ، اب آرام کرو جا کر۔" انہوں نے اسے کہا۔ وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

"اور ہاں، ادھر آؤ۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا ہے۔ رونا نہیں ہے، ٹھیک؟" وہ جو پھر رونے کی تیاری کر رہی تھی، بے اختیار مسکرا دی۔ ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ برآمدے میں چلتے ہوئے اسے اپنا دل ویران، سنسان، اداس سا لگ رہا تھا۔

اپنی ذات کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کا دل بار بار بھر رہا تھا چونکہ اسے رونا نہیں تھا اس لیے بار بار پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو بہنے سے روک رہی تھی۔ تب اپنے کمرے میں داخل ہوتا برہان اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

دوپہر ہونے والی تھی جب وہ دونوں سیاہ گاڑی میں بیٹھی آگے بڑھ رہی تھیں۔ سمیرا کو اپنی دوست کے فادر کی عیادت کے لیے جانا تھا اور اس کی ڈرائیور

زینب ڈانواں ڈول الجھن کا شکار تھی۔

"کیا یار! ہسپتال جا رہی ہو؟ تم ان کے گھر جانے کا تو انتظار کر لیتیں، پھر ان کے گھر چلے جاتے۔" زینب کو جیسے اس کے ہسپتال جانے والا آئیڈیا کوفت کا شکار کر رہا تھا۔

"سچویشن کریٹیکل ہے یار! اس لیے......" اس کی بات پر زینب نے شانے اچکا دیے۔

ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے زینب مسلسل سمیرا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی، زینب کو خود کو دیکھتا پا کر وہ پھیکا سا مسکرا دیتی اور بس۔

"تم یہیں میرا انتظار کرنا، میں دس منٹ میں واپس آتی ہوں، اوکے۔" سمیرا نے اسے گاڑی میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی تو اس نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔

وہ ونڈو کا شیشہ نیچے کیے، کہنی کھڑکی میں رکھے باہر کا جائزہ لے رہی تھی تب ہی اچانک ایک اور سیاہ اکارڈ اس سے پانچ فٹ کے فاصلے پر رکی۔ راستے میں بھی اسے مسلسل محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ اب انہیں اتنے قریب دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گاڑی میں تین آدمی بیٹھے تھے اور وہ دزدیدہ نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ اس نے جلدی سے بٹن دبا کر شیشہ اوپر کیا اور گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کرنے لگی۔

دوسری طرف...... سمیرا ہسپتال کے کیفے ٹیریا میں ارسل کے سامنے بیٹھی تھی۔ ارسل کا سخت موڈ آف تھا، وہ قدرے جھنجلایا ہوا بھی تھا۔

"ارسل پلیز، مان جاؤ۔" سمیرا ملتجی لہجے میں بولی۔

"کیا مان جاؤں؟ اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم نے اپنی بکواس بات منوانے کے لیے مجھے بلایا ہے تو میں کبھی بھی نہ آتا۔" وہ لال بھبوکا کا چہرہ لیے غصے سے کہہ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ سمیرا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"ارسل پلیز، میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ تم فون کر کے مما سے کہہ دینا کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ پھر ہو سکتا ہے ممی کو پتا چل جائے کہ جیسے وہ زینب کو ٹھکرا رہی ہیں، اسی طرح کوئی ان کی بیٹی کو بھی ٹھکرا سکتا ہے پلیز۔" وہ منت کر رہی تھی۔ ارسل کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" اسے چپ بیٹھا دیکھ کر وہ پھر بولی۔

"سمیرا، یہ اتنا نہیں ہے یہ بہت زیادہ ہے جو تم مجھ سے کروانا چاہتی ہو۔ اگر پھپھو نہیں مانیں تو...... تم جانتی ہو ناں کہ میں تم سے......"

"ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔ نہ تم میرے بغیر رہ سکتے ہو اور نہ میں ٹھیک؟ تم بس تھوڑا انتظار کرنا اگر وہ مان گئیں تو میں خود ان سے کہہ دوں گی کہ میں تم ہی سے شادی کروانا چاہتی ہوں۔" اس نے تفصیل اس کے گوش گزار کی۔ جسے سنتے ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"ٹھیک ہے، لیکن صرف تمہاری خاطر۔" وہ تنبیہہ کرتا بولا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ میں بندھی رسٹ واچ کی طرف دیکھا تو بے اختیار ماتھا پیٹا۔

"اوہ، مجھے تم سے بحث کرتے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ زینی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" وہ تیزی سے اسے اللہ حافظ کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

زینب نے پیٹی والی سیاہ فراک پہنی ہوئی تھی، جس میں پیٹی کے نیچے دونوں پہلوؤں کی طرف جیب بنی ہوئی تھی۔ ان ہی میں سے دائیں جانب بنی جیب میں اپنا موبائل رکھا ہوا تھا۔ اس نے ہلکے سے گردن موڑ کے پیچھے کھڑی سیاہ گاڑی کی طرف دیکھا، وہ تینوں اب بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل باہر نکالا، تب ہی ایس ایم ایس رنگ ٹون بجی۔ اس نے جلدی جلدی ان باکس کھولا، میسج برہان کا تھا۔

"زینب! تم کہاں ہو؟ اور کیا سمیرا تمہارے ساتھ ہے؟" وہ جلدی جلدی بولتی میسج ٹائپ کرنے لگی۔

"برہان! ہم ہسپتال آئے ہیں، سمیرا کی دوست کے ابو کی عیادت کے لیے۔ سمیرا اندر ہے اور میں پارکنگ لاٹ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔" ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ کب آنسوؤں کی لکیر سی بن گئی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"تم ٹھیک ہو؟" تین لفظ تھے، اسے لگا پوری کائنات ان تین لفظوں میں سمٹ گئی تھی۔ اس کے رونے میں شدت آ گئی۔

"نہیں برہان! میں بہت ڈر رہی ہوں کیونکہ کچھ لوگ شاید ہمیں ٹریس کر رہے ہیں۔" آج اس شخص سے بات کرتے ہوئے اسے بالکل گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔ بس گاڑی سے مت اترنا۔ میں آ رہا ہوں، کون سے ہسپتال میں ہو آپ لوگ؟" اس کا فکر کرتا لہجہ، احساس۔ اس نے آنکھیں صاف کیں اور موبائل جیب میں ڈال لیا۔ جیب میں رکھنے سے پہلے اس نے موبائل سائلنٹ پر لگانا ضروری سمجھا سو لگا دیا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے پیروں تلے زمین تب نکلی جب اس کے ساتھ کھڑی گاڑی آگے بڑھ گئی اور ان لوگوں کی گاڑی اس کی گاڑی کے ساتھ آ رکی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ رنگ زرد۔

"اوہ، اللہ تعالیٰ......" وہ زندگی میں اتنی خوف زدہ پہلے شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

"اللہ تعالیٰ پلیز......" وہ بے آواز پکار رہی تھی۔ تب ہی اس گاڑی کا دروازہ کھول کے کوئی باہر نکلا اور اس کی طرف کا دروازہ کسی آلہ سے کھولنے لگا۔

"نہیں پلیز...... نہیں......" اس سیاہ فام شخص نے تقریباً کھینچ کر اسے باہر نکالا اور اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ وہ شور کرنا چاہتی تھی لیکن وہ شخص اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اچانک اسے اپنی گردن پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

سمیرا تیز رفتاری سے چلتی آ رہی تھی، تھم سی گئی۔ اسے لگا جیسے اس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہوا۔ کچھ لوگ زینب کو اس کی گاڑی سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں تک آئی لیکن وہ لوگ جا چکے تھے۔ بے اختیار وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر سی گئی۔ اب وہ کیا کرے گی؟ کیا جواب دے گی تایا جان کو؟ اوہ اللہ، آنسو زار و قطار بہنے لگے۔ پارکنگ لاٹ میں رش نہ ہونے کے برابر تھا، کوئی اس کے قریب نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے شانے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا، وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ برہان اس کے پاس پاؤں کے نیچے موڑے بیٹھا تھا۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ سارا معاملہ برہان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے پلکیں کھولیں۔ بہ دقت پلکیں اوپر کو اٹھیں، ان پر جیسے بہت بوجھ سا تھا۔ سیاہ گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا، بالکل سیاہ...... وہ فرش پر کروٹ کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کا بایاں گال فرش پر تھا۔ بمشکل وہ اٹھ کر بیٹھی اور کمر پیچھے دیوار سے لگا لی۔ بایاں ہاتھ جو اس کے نیچے تھا اس نے سامنے کر کے اسے دیکھا، اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ دکھائی نہ دیا۔ تو کیا وہ اغوا ہو چکی تھی، ایک تکلیف دہ لہر اس کے پورے وجود میں اٹھی۔ پتا نہیں کیا وقت ہو رہا تھا۔

ابا، حمزہ، چچا، سمیرا، پھپھو سب کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اس کے لیے اور برہان...... اس کا خیال آتے ہی اس کے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ برہان اس کی فکر کر رہا تھا اس کے میسج...... میسج؟ جلدی سے اس نے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں جیب کو ٹٹولا۔ صد شکر اس کا موبائل اس کے پاس رہ گیا تھا، اس نے موبائل آن کیا تو اسکرین پر برہان کے کئی ایس ایم

ایس جگمگا رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ان باکس کھولا۔

"زینب! تم کہاں ہو؟" اس کی سسکی بلند ہوئی۔

"زینب! کیا تم ٹھیک ہو؟" وہ اس کے لیے فکر مند تھا۔

"تم بالکل بھی فکر مت کرنا۔ میں...... میں تمہیں بہت جلد ڈھونڈ لوں گا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نہیں یہ وقت رونے کا نہیں تھا، ہمت کرنے کا تھا۔ اس نے موبائل مضبوطی سے تھام کر کال لاگ آن کیا۔ کپکپاتے ہونٹ، لرزتی انگلیاں...... خوف...... وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اس اندھیرے کمرے میں اکیلی تھی۔ کسی کے آجانے کا خوف، پکڑے جانے کا ڈر...... اسے کس کو کال کرنی چاہیے؟ اس نے لرزتی انگلیوں سے برہان کا نمبر ملایا تب ہی دور کہیں...... دور قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"نہیں، پلیز اللہ تعالیٰ! میری مدد کر۔" بیل جا رہی تھی، قدموں کی چاپ قریب ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کال نہ اٹھانے کا پیغام ملا۔ اس نے جلدی سے موبائل بند کیا اور جیب میں ڈال کر دم سادھ کر لیٹ گئی کہ جیسے بے ہوش ہو۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور قدموں کی چاپ اس کے بالکل قریب آگئی۔ اس شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے آیا۔ ناچاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ سیاہ فام اسے ایسے ہی گھسیٹتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ وہ رات اذیت کی رات تھی۔ تکلیف وہ رات...... سب راتوں پہ بھاری رات۔

اس کمرے میں دو شخص اور بیٹھے تھے، وہی دونوں جو گاڑی میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں شخص دہکتے الاؤ کے گرد بیٹھے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ انہیں سن سکتی تھی۔ اس سیاہ فام شخص نے اسے ہوش میں دیکھ کر ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ بنا اعتراض کے بیٹھ گئی۔ وہ شخص اسے باندھنے لگا تھا تو اس کی سانس رک گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے بابر! کہ ڈی ایس پی مان جائے گا؟" ایک آدمی جو عجیب سی نظروں سے اسے گھور رہا تھا، اپنے سامنے بیٹھے شخص سے بولا۔

"اسے ماننا ہی پڑے گا، اب اس کے پاس ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ویسے قاسم! یہ لڑکی ہے کمال کی چیز۔" بدبو میں ڈوبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا اور کچھ لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ ٹھنڈ ضرورت سے زیادہ تھی۔ وہ جو کرسی پر بندھی بیٹھی تھی، اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

"اللہ تعالیٰ پلیز...... میرے لیے میری عزت کے سوا کچھ اہم نہیں ہے۔" وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

"روتی کیوں ہو ڈیر! تمہارا عاشق تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے، ایسا اس نے خود کہا ہے۔ تمہاری خاطر تو اسے ہماری ڈیمانڈز ماننی ہی پڑیں گی۔"

دہکتی لکڑیاں اس کے جمے ہوئے خون کو حرارت بخش رہی تھیں۔ اس کا دل بند ہوتے ہوتے بچا۔ اچانک فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی اور عین اسی وقت جیب میں رکھے اس کے موبائل کی اسکرین چمکی اور اس روشنی پر پڑی۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ دونوں لڑکے حواس باختہ سے ہو گئے جبکہ تیسرا شخص جس کا نام بابر تھا، اس نے غصے سے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا موبائل باہر نکالا۔

چٹاخ...... چٹاخ...... یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔ تھپڑ اس قدر زور آور تھے کہ اس کا ہونٹ کنارے سے پھٹ گیا اور خون قطرہ قطرہ ٹھوڑی سے بہنے لگا۔ غصے سے اس شخص کا برا حال تھا۔ فرش پر بہت سارے جوتوں کی آواز آنے لگی یقیناً وہ لوگ اس گھر کے اندر داخل ہو چکے تھے اور وہ

بابر نامی شخص غصے سے پاگل ہوا۔ اردگرد کچھ ڈھونڈ رہا تھا شاید۔ اچانک اس کی نظر ایک سلاخ پر پڑی جو بابر کے ہاتھ میں تھی۔

"نہیں...... پپ...... پلیز...... نہیں...... نہیں......" حیرت، خوف، بے یقینی...... بابر نے اس سلاخ کو پورے زور سے اس کی ٹانگ پر دے مارا اور اس کی دل خراش چیخ پورے کمرے میں گونج گئی۔ دروازہ دھڑ دھڑا پیٹا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں سے، مکوں سے اور ہاتھوں سے۔ اس کی چیخیں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ بابر نے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اس کو زمین پر دے مارا، تب ہی دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس کی اعصاب جواب دے رہے تھے شاید...... اس نے اندر داخل ہونے والے کے جوتوں کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل رہا تھا۔ آخری منظر جو اس کی آنکھوں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ بابر اب زمین پر پڑا تھا۔

☆☆☆

کتنا وقت گزرا، کتنے لمحے بیتے، کتنے پل گزرے اسے نہیں پتا۔ وہ بے ہوش تھی، اس کے اعصاب دباؤ کا شکار ہو گئے تھے شاید۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب بحال ہونے لگے تھے۔ وہ ٹھکانے پر آنے لگے تھے۔ لیکن نہیں، اسے ہوش میں نہیں آنا۔ وہ ہوش میں نہیں آنا چاہتی۔ کیسے کرے گی، وہ سب کا سامنا۔ کیا منہ دکھائے گی اپنے بابا کو...... اس کی پلکیں لرزش کا شکار تھیں۔

"زینب!" بہت ہولے سے کسی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ بر...... برہان...... ہاں برہان نے پکارا تھا اسے۔

"زینی! اٹھ جاؤ پلیز۔" آہستہ سے اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اب اسے آنکھیں کھول دینی چاہئیں۔ اس نے بہ دقت پلکیں اٹھائیں۔ پپوٹے بہت بھاری ہو گئے تھے۔ بے اختیار اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"زینی! آر یو او کے۔" اس کا لہجہ فکرمندی لیے ہوئے تھا۔ آنکھیں تھکی تھکی سی تھیں۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ یہ وہ کمرہ کسی ہسپتال کا لگ رہا تھا۔ کیا وہ اسپتال میں تھی، اس کی تو جیسے سانس ہی اٹک گئی۔

"ہم کہاں ہیں؟" اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایک لیڈی ڈاکٹر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہیں اب آپ؟" وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پہ سجائے اس کے پاس چلی آئی۔

"تھینکس ڈاکٹر نوال!" برہان اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اس کے بدلے مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔" وہ شاید کافی دیر بعد مسکرایا تھا۔

"میں یہی مانگنا چاہتی ہوں کہ اگر تمہیں پھر کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو میرے ہی پاس آنا۔" وہ پراعتماد انداز میں گویا ہوئی۔ نوال برہان کی پرانی گہری دوست تھی شاید۔

"ہم جائیں اب؟"

"ہاں، ویسے بھی اب صبح ہونے والی ہے۔ زیادہ گہری چوٹیں نہیں ہیں۔ پنڈلی پر گرم سلاخ زیادہ زور سے مارے جانے کی وجہ سے زخم تھوڑا گہرا ہے۔ اس لیے کچھ دن تک یہ چل نہیں پائیں گی تو انہیں وہیل چیئر پر......"

"ہاں ہاں یار! سمجھ گیا۔ بٹ تھینکس اگین۔" اس کی بات کاٹ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بائی دا وے برہان! یہ لڑکی......"

"یہ لڑکی میری وائف ہے۔ اب ہم جائیں۔" اس کی بات پر ڈاکٹر نوال کی بے ساختہ ہنسی فضا میں گونجی۔

"ہاں...... ہاں جائیں آپ لوگ۔ ایک آخری بات۔" برہان کے قریب آئی اور دھیمی آواز

میں پتا نہیں کیا کہا، زینب جان نہ سکی۔ اس کی بات سن کر وہ مسکراتا ہوا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

☆☆☆

گہری سیاہ رات بیت چکی تھی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور اذان کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ ارمان، انابیہ اور علیشا کے علاوہ باقی سب افراد لاؤنج میں پریشان و متفکر سے بیٹھے تھے۔ ہر شخص کی تکلیف چہرے سے عیاں تھی۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ بالکل خاموش...... پورا لاؤنج سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ تب ہی گیٹ پر برہان کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا۔ جھکے ہوئے تمام چہرے اوپر اٹھے۔ گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور پھر گاڑی کے ٹائروں کی۔ حمزہ جو بیٹھا ہوا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا۔ حمزہ نے آگے بڑھ کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا۔ وہ اسے لیے لاؤنج کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

برہان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دونوں نے دائیں بائیں اسے تھام رکھا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے، بیٹھے ہوئے تمام افراد کھڑے ہو گئے۔ زینب رو رہی تھی۔ وہ داؤد صاحب کے سینے سے لگی، روتی رہی۔ چچا غصے سے لال پیلے ہوئے جا رہے تھے، انہیں شدید غصہ تھا۔ برہان سر جھکائے کھڑا تھا اور تمام حالات و واقعات سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔

"مجھے سونا...... ہے...... تم...... تم لوگ جاؤ۔ یہاں سے۔" سمیرا اور اریشہ اسے چھوڑنے آئی تھیں۔ اس کا دوٹوک انداز...... وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔ کپڑے وہ چینج کر چکی تھی۔ ہلکے انگوری رنگ کا کرتا جس پر میرون کڑھائی تھی۔ خالی خالی آنکھوں سے فرش کو تکتی وہ بہت زخمی دکھائی دے رہی تھی۔ اریشہ اور سمیرا دونوں اس کے پاس چلی آئیں۔

"ہمارے جانے کے بعد صرف سونا ہے تم نے۔ رونا نہیں، اوکے۔" اریشہ نے اس کا زخمی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

"صرف...... صرف تمہاری وجہ سے آج یہ دن آیا ہے۔ اس کی وجہ صرف تم ہو برہان! تم...... تمہاری وجہ سے آج یہ دن دیکھنا پڑا ہے ہم لوگوں کو۔ تمہاری وجہ سے آج اتنی تکلیف سہی ہے اس بچی نے۔ مجھے شرم آ رہی ہے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے برہان!" چچا کی آواز غضب کے عالم میں پورے لاؤنج میں گونج رہی تھی، سب سہم سے گئے تھے۔ برہان کی ٹھوڑی گردن سے چپک گئی تھی۔

"چچا جان! پلیز...... آپ برہان......" حمزہ نے آگے بڑھ کر انہیں ٹوکنا چاہا مگر......

"تم خاموش رہو۔" لہجہ اتنا سپاٹ تھا کہ وہ وہیں رک گیا۔ خاموشی نے ایک بار پھر لاؤنج کے احاطے میں ڈیرا ڈال لیا۔ پھر اچانک عابدہ بیگم کے موبائل کی بپ بجی۔

"ارسل!" نام پڑھ کر وہ کچھ حیران ہوئی تھیں۔ نام سب نے بخوبی سنا تھا۔ سمیرا کا تو مانو دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے پسلیاں توڑ ڈالے گا۔

"اوہ خدایا، ارسل! نہیں...... تم کچھ مت کہنا۔" سمیرا دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔ اس کے خیال میں اب سب ٹھیک ہونے والا تھا لیکن یہ صرف اس کا خیال تھا۔ عابدہ بیگم نے کال پک کر کے فون کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے ارسل شاید حال احوال معلوم کر رہا تھا، عابدہ بیگم مسکراتے ہوئے اسے جواب دے رہی تھیں۔ پھر اچانک ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ مسکراہٹ کی جگہ الجھن و بے یقینی نے لے لی۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ سب بغور ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سمیرا کا تو جیسے سانس گھٹنے لگا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ لاؤنج میں بالکل سناٹا تھا۔ موبائل کے اسپیکر سے آنے والی ارسل کی آواز کو سنا جا سکتا تھا۔

"پھپھو...... میں...... میں سمیرا...... سے شادی نہیں...... نہیں کرنا چاہتا۔" اٹک اٹک کر جملہ مکمل کیا گیا۔ بم تھا جو سب کی سماعت پر پڑا۔ عابدہ بیگم کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ موبائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ان کے دامن میں گر گیا۔ سمیرا کے آنسو بے اختیاری میں بہہ نکلے۔ بے اختیار وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اریشہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی سو اس کے پیچھے لپکی۔ پھپھو اٹھ کر عابدہ چچی کے پاس بیٹھ گئیں۔

عابدہ چچی اب باقاعدہ رونے لگیں۔

"آپ روئیں نہیں بھابھی! ہو سکتا ہے ارسل کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ناسمجھ بچہ ہی تو ہے وہ۔ ہم حمید بھائی سے بات کریں گے، ایسے تھوڑی ہی رشتے ٹوٹتے ہیں۔" پھپھو نرم لہجے میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

"زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے یہ، بس مکافاتِ عمل ہے۔" حسین صاحب کا انداز چونکانے والا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب بالکل واضح ہے، ہم کو ہمیشہ وہی ملتا ہے جو ہم دوسروں کو دیتے ہیں۔ ہم سب انسان ہیں بالکل عام انسان...... ہم مکاری سے دوسروں کے ساتھ برا کرتے ہیں اور ہم اتنے ناسمجھ ہوتے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے ہمارے ساتھ اچھا کیا جائے گا؟ اپنے رویوں سے دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں اور ہمیں لگتا ہے ہمارے کہے گئے الفاظ واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے؟ ایسا نہیں ہوتا، ایسا کر کے ہم محض خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ اللہ ہے نا، جو بہت انصاف کرنے والا ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیتا۔" چچا سانس لینے کو رکے اور عابدہ چچی کی طرف گھومے۔

"تمہیں کیا لگتا تھا کہ تم زینب کے لیے انکار کر دو گی اور خود بچ جاؤ گی۔ تمہیں نہیں بھولنا چاہیے تھا عابدہ کہ تم خود دو بیٹیوں کی ماں ہو اور بیٹیوں کے دل بہت حساس ہوتے ہیں۔ میں سب کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ آج سمیرا کے ساتھ جو ہوا اس سب کی وجہ صرف تم ہو۔ برہان کو گمراہ کرنے کی وجہ بھی تم ہو۔" سخت غصہ، سرد لہجہ، سپاٹ تاثرات دیکھ کر سب بے یقین رہ گئے۔ عابدہ بیگم کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"بھائی پلیز۔" پھپھو بے بسی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور برہان اب بھی وہیں کھڑا تھا، گردن جھکائے، شرمندہ سا۔ قدم قدم چلتا وہ حسین صاحب کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ انہوں نے رخ پھیر لیا۔ سخت ناراضی کا ثبوت۔ اچانک بادلوں کی گرج کی آواز آئی اور...... اور پھر تیز ہوا لاؤنج کی قد آور کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔ سیاہ رات کا اختتام ہو گیا تھا لیکن اب بھی ہر سو اندھیرا تھا۔ ٹھنڈ تھی، سردی بھی سخت تھی۔

"آئی ایم سو...... سوری پاپا!" برہان نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

وہ ان کی پہلی اولاد تھا۔ سب سے زیادہ لاڈلا۔ سب سے زیادہ محبت انہوں نے اسی سے تو کی تھی۔ اچانک بجلی چمکی۔ پل بھر میں پورا لاش روشن ہو گیا۔

"آئی ایم سوری پاپا! مجھے معاف کر دیں پلیز......" وہ منت کر رہا تھا۔ بارش کی تیز بوچھاڑ کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ حماد نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔

"ویل...... تمہارے سوری کہنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" حسین صاحب کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ طنز کرتا ہوا۔ وہ آج سارے حساب چکانے کے موڈ میں تھے۔

"چچا جان! آپ برہان کو ایک موقع تو دیں۔ ہو سکتا ہے، سب ٹھیک ہو جائے۔" حمزہ جو کب کا خاموش بیٹھا تھا، اب بولا تو برہان کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"ہاں پاپا! مجھے ایک موقع دیں، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

"برہان! کیا تمہیں لگتا ہے، آج اس گھر میں جو تکلیف دو بچیاں برداشت کر رہی ہیں، تم اس کا مداوا

"کرلو گے؟" حسین صاحب کا لہجہ اب بھی بے یقین تھا۔

"حسین! بس کر جاؤ۔ تم بچے کا حوصلہ مت توڑو۔" داؤد صاحب نے انہیں ٹوکا۔

"چلیں، دیکھتے ہیں بھائی!" بے اعتباری سے شانے اچکا کر وہ وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی بغور اپنے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے کے زخم اسے تکلیف نہیں دے رہے تھے بلکہ کچھ اور وجہ تھی جس سے وہ تکلیف میں مبتلا تھی۔ درد...... تکلیف...... جلن...... گھٹن...... اس کا دم گھٹنے لگا۔

عابدہ چچی کی نظریں اسے اپنے جسم کے پار ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی نفرت و ناپسندیدگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں چبھن واضح تھی۔ خیر وہ جلد یا بدیر ان کی خواہش پوری کر دے گی۔ پھر وہ جس سے چاہیں گی، اپنے برہان کی شادی کر دیں گی۔

اس کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی، زمین پر کرسی سمیت گرنے کی وجہ سے گہرا زخم آیا تھا۔ ہونٹ بھی پھٹا تھا۔ پنڈلی بھی زخمی ہوئی تھی لیکن نہیں...... یہ زخم اسے زیادہ تکلیف نہیں دے رہے تھے۔ برہان سے دوری زیادہ تکلیف دہ ہوگی؟ آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ کھڑکی سے زمین پر گرنے والی تیز بوندیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رونے لگی۔ سسکیاں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔

"برہان نے مجھے کبھی ایکسیپٹ نہیں کیا، تب بھی نہیں جب میں پاکیزہ تھی۔ پاکیزہ تو اب بھی ہوں لیکن...... اب میں اغوا شدہ اور داغ دار ہوں۔ اب تو وہ میری طرف دیکھے گا بھی نہیں۔" سسکیاں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ کیا زندگی میں اسی حادثے کی کمی تھی. جواب پوری ہوگئی تھی؟

"آئی ایم سوری زینب!" کہیں بہت قریب سرگوشی کی آواز آئی۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ چہرا ہاتھوں میں چھپائے ہوئے بیٹھی رہی۔ بالکل ساکت۔

"زینب! کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟" بے یقین سا لہجہ یقین چاہتا تھا، جیسے۔ اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔ پلکیں اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ سرخ متورم آنکھیں اور بھی دلکش لگ رہی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ اسٹول پر بیٹھی تھی اور وہ اس کے پیچھے اداس سا کھڑا تھا، اس نے چہرا جھکا دیا۔

"کچھ تو بولو پلیز، مجھے تمہاری خاموشی سے......" جھنجلایا سا لہجہ، اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"زینی! کیا تم جانتی ہو، مجھے تم سے محبت کب ہوئی؟" اس کا عجیب سوال، پراسرار لہجہ، زینب نے ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے کو سختی سے پکڑ لیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے بہت سی شکایات ہیں، میں نے بہت دفعہ تمہاری انسلٹ کی ہے۔ بہت بے عزت کیا ہے تمہیں لیکن...... لیکن میں نے اس دن پیزا ہٹ میں تمہاری انسلٹ اسی لیے کی تھی کہ تم زیادہ باہر مت نکلو اور مجھے ان کریمنل کی سامنے جھکنا نہ پڑے۔ پلان کے مطابق تم بہت سارے دن باہر نہیں گئیں اور تمہاری وجہ سے باقی لڑکیاں بھی۔" وہ سانس لینے کو رکا۔ زینب کا چہرہ اب بھی جھکا ہوا تھا۔

"لیکن زینی! میں جب بھی تمہاری انسلٹ کرتا اس کے بعد میں تم سے معافی مانگنے بھی تو آجاتا تھا نا۔"

اس رات برستی بارش میں وہ اس کے پیچھے چھت پر گیا تھا لیکن معافی...... نہیں بالکل نہیں۔ وہ کب آیا تھا اس سے معافی مانگنے؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"تم سوچ رہی ہوگی کہ میں کب آیا تم سے

غلطی معافی مانگنے، رائٹ۔ خیر، اب میں تم سے اپنی ہر گستاخی کی معافی مانگتا ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟ میں تمہارے سامنے گھٹنوں کے بل......"

وہ واقعی اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تو وہ بے اختیار "نہیں، نہیں" کہہ کر جیسے جھٹکے سے اٹھی۔ درد کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ زخمی پنڈلی اسے کھڑا کرنے سے قاصر تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی کہ برہان نے اسے تھام لیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کو تھامنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ مارا اور ایک گلدان نیچے گر کر کرچیوں میں تقسیم ہو گیا۔ وہ اسے اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھامے کھڑا تھا۔ بے اختیار بہت سے آنسو اس کے رخساروں کو بھگونے لگے۔

"زینب رو نہیں پلیز۔ میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔" وہ اسے لیے بیڈ تک آیا۔ وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ برہان بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے، وہ اب بھی رو رہی تھی۔

"زینب! میں...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ تم جو چاہو گی، تمہیں وہ ملے گا۔ بس تم مجھے معاف کر دو اور...... اگر تم اب بھی چاہو گی تو میں تمہیں خلع......"

"نہیں چاہیے مجھے خلع...... سمجھتے کیوں نہیں ہو تم؟ وہ سب...... صرف ایک جذباتی فیصلہ تھا۔ جو...... جو میں نے کیا تھا۔" اپنے ہاتھ چھڑا کر وہ اونچی آواز میں چلانے لگی۔ اس کے اس طرح چلانے پر وہ تھوڑا بوکھلایا اور جلدی جلدی جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔ پانی کا گلاس اسے پکڑایا جسے وہ چند گھونٹ میں اتار گئی۔

"برہان! محبت کرتی ہوں میں تم سے...... کیوں نہیں کرتے، تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے۔ تمہیں کھو دینے کا ڈر مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ میں اکیلی ہو جاتی ہوں یہ سوچ کر۔ مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ برہان! میں نے تم سے شدید محبت کی ہے۔ میں اب تمہیں ہارنا نہیں چاہتی۔" وہ اس کے بازو پر سر رکھ کے بری طرح رو رہی تھی۔

"گڈ...... وری گڈ۔ میں یہی سننا چاہ رہا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ محظوظ سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا (ایڈیٹ نہ ہو تو) وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

"برہان! تم بہت برے ہو۔" وہ جیسے اسے آگاہ کر رہی تھی، وہ ایک بار پھر کھل کے مسکرایا۔

"ہاں، مجھے بھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ میں بہت برا ہوں۔ خود غرض ہوں، ڈھیٹ ہوں، اکھڑ مزاج ہوں۔" اس کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ زینب کی بے اختیار ہنسی پورے کمرے میں گونج گئی۔

"شکر ہے، تمہاری ہنسی سننے کو ملی۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ جھینپ گئی۔

"خیر تو مادام! میں آپ کے ساتھ اپنی پوری زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور یقیناً آپ بھی ایسا ہی چاہتی ہوں گی۔ میں تقریباً خشک مزاج اور ریزرو سا بندہ ہوں۔ کیا آپ خوش رہیں گی، میرے ساتھ۔" وہ آہستہ آہستہ نرم آواز میں کہہ رہا تھا، زینب نے شرم سے سرخ پڑتے سر جھکا لیا۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن برہان! وہ چچی جان......" خوف، اضطراب، بے چینی سب کچھ تھا اس کے انداز میں۔

"ڈونٹ وری، مما کو میں منا لوں گا۔" اس نے اسے تسلی دی۔ وہ بس سر جھکا کر مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔ ایک کام تو ہو گیا، بس اب دوسرا کر لوں۔ پھر ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ زینب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ قدم قدم چلتا دروازے تک آیا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر چوکھٹ پار کر گیا۔ زینب نے شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں بارش تھم چکی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی بھی پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ارسل کے والد حمید اصغر کے ڈرائنگ روم میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔ شہلا بھابھی (ارسل کی ماں) ہونق بنی سب کے منہ دیکھ رہی تھیں۔ عابدہ بیگم کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ برہان داؤد صاحب کے دائیں جانب بیٹھا تھا۔ سنجیدہ چہرا، واضح غصہ۔ حمید صاحب حیرانی و پریشانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھپھو عابدہ چچی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

''ارے بھائی صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ارسل اتنی غلط بات کیسے کہہ سکتا ہے؟'' شہلا بھابھی کا سکتہ ٹوٹا اور وہ حسین صاحب سے گویا ہوئیں۔

''ہم غلط بیانی نہیں کررہے ممانی! ارسل نے خود کہا ہے یہ سب۔'' برہان نے سنجیدگی سے کہا۔ بات ان کے لیے بھی ناقابل یقین تھی کیونکہ ارسل کے کہنے پر ہی تو یہ منگنی ہوئی تھی۔

''ارسل کب تک آئے گا۔ ہم اسی سے معلوم کرلیں گے کہ ایسا اس نے کیوں کہا۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں، بچے ہیں ابھی یہ...... اچھے برے کا پتا نہیں ہے انہیں۔ ٹھیک سے۔'' داؤد صاحب اپنی نرم آواز میں کہہ رہے تھے۔ حالانکہ انہیں سنجیدہ ہونا چاہیے تھا لیکن معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے اگر وہ بھی سخت سنجیدہ ہوجاتے تو بات کیسے بنتی؟

''دیکھیں عابدہ آپا! ارسل نے جو بھی کہا ہوگا میں اس کی آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ پلیز، اس کی بات بھول کر ہمیں معاف کردیں۔ میں نے تو سمیرا کے سوا کسی اور کو بہو بنانے کا تصور بھی نہیں کیا۔ پھر ہم اتنی آسانی سے کیسے......'' داؤد صاحب کی بات سے شہلا بھابھی کو تقویت ملی تو وہ کہنے لگیں۔

ارسل کی تو صحیح معنوں میں سٹی گم ہوگئی تھی۔ پھر خود کو کمپوز کرتا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ایک ایک کرکے سب سے ملنے لگا۔ عابدہ بیگم کے بہتے آنسو اور سب کے سنجیدہ چہروں سے اسے اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔

''کیا ہم جان سکتے ہیں کہ تم نے آپا کو فون کرکے وہ بکواس کیوں کی تھی؟'' حمید صاحب کے تنے ہوئے نقوش اور بھنچے ہوئے لب اس کی رگوں میں بہتے ہوئے خون کو منجمد کرنے لگے تھے۔ اس نے بہت آس سے چہرا اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''ایم سوری، میں نے وہ سب......'' وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ شہلا بھابھی بول اٹھیں۔

''تم نے جیسے بھی کہا ہو بس اب ہم نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''یہی کہ پندرہ دن بعد تمہاری شادی ہے، وہ بھی سمیرا سے۔ کیوں حسین! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔'' داؤد صاحب نے تائیدی انداز میں کہا تو اس نے کھل کے سانس لیا۔ سب بے اختیار مسکرا دیے۔ حسین صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ یہ واقعہ عابدہ بیگم کو سبق سکھانے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

ہر سو شام اتری ہوئی تھی۔ ہر شخص کے چہرے سے اس کی خوشی عیاں تھی۔ سمیرا اور ارسل کی شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔ زینب کے زخم مندمل ہوگئے تھے لیکن احتیاطی تدابیر کے طور پر وہ ابھی وہیل چیئر کا استعمال کررہی تھی۔ سب لوگوں کے بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ دونوں گھروں میں خوشیوں کی پریاں اتری ہوئی تھیں۔

زینب کا کام کرنا بالکل بند تھا۔ عابدہ بیگم کا رویہ اس سے بہتر ہوتا جارہا تھا۔ چچی نے سب کے سامنے اعتراف کیا تھا۔

''آج سے پہلے میں نے زینب کے ساتھ جو زیادتی کی ہے، میں سب کے سامنے اس سے معافی مانگتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ سمیرا کے ولیمے پر ان دونوں کے نکاح کو منظر عام پر لے آئیں۔'' چچی کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

وہ شرم سے لال ہوئی سر جھکا گئی۔ چچی کو نصیحت مل گئی تھی، چاہے ایک ٹھوکر سے ہی ملی تھی۔ اس سے بڑی خوشی کی بات ہوسکتی تھی بھلا۔ سب خوش تھے، بہت زیادہ خوش۔

آج شام کی چائے پر سب آہستہ آہستہ لان میں جمع ہورہے تھے۔ وہ بھی اپنی چیئر گھسیٹتی جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی، برہان اسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا۔ وہ اسی کی طرف آرہا تھا۔

''زینی! اب تمہیں کوشش کرنی چاہیے۔ اپنے پاؤں پر چلنے کی۔ آؤ، میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ چلو شاباش۔'' برہان نے اپنے ہاتھ کی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے کی تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے نفی میں گردن ہلادی۔

''نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی زخم ابھی بالکل ٹھیک نہیں ہوئے۔'' تحمل سے کہہ کر وہ آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور پھر ایک پاؤں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم پریشان کیوں ہو؟'' اس نے پوچھا تھا کہ وہ پریشان کیوں ہے؟ یعنی وہ جانتا تھا کہ وہ واقعی پریشان ہے۔

''برہان! اٹھ جاؤ، کوئی دیکھ لے گا۔'' ڈرتے ہوئے وہ اسے تنبیہہ کررہی تھی۔

''ہم نامحرم تھوڑی ہیں جو کوئی دیکھ لے گا، تو برا سمجھے گا۔'' اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

''بتاؤ، اب کیا بات ہے؟'' وہ جاننے پر مصر تھا۔

''برہان! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں گزرا وقت دوبارہ آگیا؟ میں نے بہت مشکل سے تمہیں پایا ہے۔ میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کل کو اگر کسی کو اس حادثے کا پتا چل گیا تو......''

''زینب! پہلی بات وہ حادثہ ہم سب گھر والوں کے درمیان راز ہے اور یقیناً ہماری فیملی کو راز رکھنے تو آتے ہی ہوں گے اور دوسری بات جب تک میں ڈی ایس پی ہوں، ہمارا گزرا کل دوبارہ نہیں آسکے گا اور میں اپنی پوری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، سو اس وجہ سے ہمیں کوئی الگ نہیں کرسکے گا اور اب تمہیں اس وجہ سے پریشان نہیں ہونا ورنہ میں برا مانوں گا ٹھیک۔'' اس کا نرم ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلادیا۔

''اب چلو، باہر ہماری فیملی ہماری منتظر ہوگی۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا جسے فوراً زینب نے تھام لیا۔ وہ اسے لیے آہستہ آہستہ لان کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں بیٹھے سب افراد ہی مسکرا رہے تھے۔ عابدہ بیگم نے اپنے ساتھ والی کرسی خالی کروائی جہاں سمیرا بیٹھی تھی۔ سمیرا اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''عائشہ! زوہیب سے بات کرو، اور اسے بھی بلاؤ۔'' داؤد صاحب نے جیسے حکم صادر کیا تھا۔ پھپھو الجھی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

''خیریت؟''

''ارے بھئی، وہ بھی آجائے تو ہم دونوں سے بھی فارغ ہوں۔ اب ان کا فرض بھی تو ادا کرنا ہے نا۔'' انہوں نے اریشہ اور حمزہ کی طرف اشارہ کیا تو سب بے ساختہ ہنس دیے۔ اریشہ نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

''ٹھیک ہے بھائی! میں کروں گی ان سے بات۔'' پھپھو خوشی اور تشکر سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کے سائے تھے۔

Courtofiction.com